www.urducouncil.nic.in
قیمت: -/10 ₹

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

اپریل 2021

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

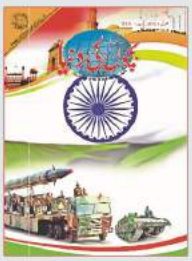

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

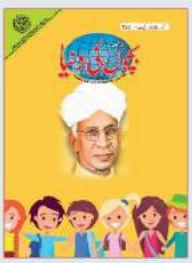

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
شخصیت	ممتاز شیریں کی افسانہ نگاری	ڈاکٹر مسرت	5
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		11
جہان نسواں	اعلیٰ تعلیم میں خواتین کی حصہ داری	ایم اے کنول جعفری	12
	'بارش سنگ' کا تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر حنا آفریں	17
	ہندوستان میں تصوف کی روایت	ڈاکٹر رئیسہ پروین	23
	ہندوستان کی مشترکہ تہذیب	ڈاکٹر شاہینہ تبسم	29
	جدید اردو غزل میں خواتین کے مسائل کی عکاسی	محمد یونس ڈار	32
	اردو شاعری کے یاور شجاع خاور	سیدہ جیفر رضوی	36
	کہکشاں پروین کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ	ناز آفرین	40
کہانیاں	رمضان پیکیج	رخسانہ نازنین	45
	حقیقت کا آئینہ	طلعت جہاں سروہا	48
حسن سخن	مردلاگھئی، سیدہ تبسم منظور ناڈکر		51
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		53
صحت	دوران حمل ذیابیطس شکری	ڈاکٹر محمد صفوان قدوائی	55
آرائش و زیبائش	حسن کی نگہداشت		58
تاثرات	تاثرات نگر نگر سے		60
خواتین خبرنامہ			61

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 5 شمارہ: 4 اپریل 2021

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: الیس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL)
اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون:49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

مشعل

حمل شادی شدہ خواتین میں ایک فطری عمل ہے اور اس عمل سے دنیا کی تقریباً تمام عورتیں گزرتی ہیں۔ پوری دنیا میں بچے کی پیدائش کو باعث مسرت سمجھا جاتا ہے۔

خواتین زچگی جیسے سنگین مراحل سے گزرتی ہیں۔ زچگی کے دوران اگر احتیاط نہ برتی جائے تو موت کا خطرہ بھی لاحق ہوسکتا ہے۔ کچھ خواتین کو دوران حمل بہت سی پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کچھ زچگیوں میں تو آپریشن تک نوبت آجاتی ہے۔ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ خواتین مکمل طور پر احتیاطی تدابیر کا خیال نہیں رکھتیں۔ ہر روز اور ہر منٹ میں کہیں نہ کہیں کوئی عورت دوران زچگی موت سے ہمکنار ہوتی ہے۔ ایسی اموات ان علاقوں میں زیادہ ہوتی ہیں جہاں مکمل انتظام وانصرام نہیں ہوتا اور طبی سہولیات اور ڈاکٹر میسر نہ ہونے کے سبب کچھ اہم مسائل درپیش رہتے ہیں۔

ہندوستان میں ہر سال تین لاکھ سے زیادہ بچے پیدا ہونے کے چوبیس گھنٹوں کے اندر ہی فوت ہوجاتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ حفظان صحت کا ناقص نظام ہے۔ ہندوستان کے جن حصوں میں مفلسی، خواندگی اور بیداری کی کمی ہے ان علاقوں کی خواتین دوران زچگی بہت سی پریشانیوں میں مبتلا رہتی ہیں۔ غذا کی کمی کی وجہ سے حاملہ خواتین کے ساتھ ساتھ ان کے بچے بھی موت سے ہمکنار ہوجاتے ہیں۔ بہت سے علاقوں میں بہت کم عمر کے دوران لڑکیوں کی شادیاں کردی جاتی ہیں۔ کم عمر کی شادیاں شہری علاقوں کی بہ نسبت دیہی علاقوں میں زیادہ دیکھنے کو ملتی ہیں۔ کیونکہ دیہی علاقوں میں تعلیم کا کوئی معقول انتظام نہیں ہوتا اور تعلیم کی کمی کے ساتھ ساتھ رسم ورواج اور معاشرے کا دباؤ بھی رہتا ہے جس کے پیش نظر والدین بچیوں کی شادیاں کم عمر میں ہی کردیتے ہیں۔ کم عمر میں شادی ایک سماجی مسئلہ ہے۔ اس کو روکنے کے لیے حکومتی سطح پر قانون بنے ہوئے ہیں۔

آگہی کسی بھی بیماری کو روکنے میں بہت موثر ثابت ہوتی ہے۔ اس بارے میں خواتین کو وقتاً فوقتاً تعلیم دی جاتی ہے جس کے مثبت اثرات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ تاہم ابھی بھی، حفظان صحت اور خاص طور پر خواتین سے جڑے تولیدی مسائل جوں کے توں بنے ہوئے ہیں۔

حمل کے دوران صحت مند رہنے کے لیے خواتین خوراک اور ورزش پر توجہ دیں تو بہت سی پریشانیوں سے بچا جاسکتا ہے۔ اس بارے میں خواتین ڈاکٹر سے رجوع کرسکتی ہیں۔ خواتین دوران حمل اور زچگی کے بعد اپنا مکمل طور پر خیال رکھیں۔ بچے کی پیدائش کے فوراً بعد ماں میں کچھ اہم نفسیاتی بیماریوں کے ہونے کا خطرہ زیادہ رہتا ہے۔ میلیا، ڈپریشن، شیزوفرینیا ان میں اہم ہیں۔ یہ بیماریاں جسم میں ہارمونز کی کمی کے باعث پیدا ہوتی ہیں۔

حمل کے وقت اگر ان کو خاطر خواہ نگہداشت میسر ہو تو ان میں سے بیشتر کی اموات کی روک تھام ممکن بنائی جاسکتی ہے۔ مناسب طبی نگہداشت اور زچگی سے متعلق عملے کی طبی تربیت کے ذریعے حاملہ خواتین کو تحفظ فراہم کیا جاسکتا ہے۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاکٹر مسرت

ممتاز شیریں کی افسانہ نگاری

ممتاز شیریں اردو ادب کی پہلی خاتون نقاد مانی جاتی ہیں۔ ان کے یہاں اعلیٰ تعلیمی شعور دکھائی دیتا ہے۔ افسانے کی تنقید میں انھوں نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ افسانہ نگاری کی حیثیت سے بھی انھوں نے اپنی پہچان بنائی لیکن ان کو اردو کی اولین نقاد اس لیے مانا جاتا ہے کہ انھوں نے باضابطہ پہلی دفعہ افسانے کے فن، تکنیک اور تنوع پر خاصا زور دیا اور ان کو فن کی کسوٹی پر پرکھا اور واضح کیا کہ افسانے میں ان کا ہونا بہت ضروری ہے۔ ممتاز شیریں سے پہلے اردو ادب میں ایسی کوئی خاتون نظر نہیں آتی جس نے تنقید کی طرف توجہ دی ہو یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ رشید جہاں کے یہاں شروعاتی دور میں کچھ ایسی تحریریں منظر عام پر آئیں جنھوں نے عوام الناس کے ذہنوں کو جھوڑا اور ان کی توجہ اپنے افسانوں کی طرف مبذول کرائی۔ اس وقت کی سماجی اور مذہبی روایت پر رشید جہاں نے اپنے افسانوں کے ذریعے کاری ضرب لگائی۔ رشید جہاں ہی وہ خاتون تھیں جو

ایک ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ادب سے بھی خاصی دلچسپی رکھتی تھیں۔ ان کی تحریروں میں سماجی اور مذہبی کرب کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے اس وقت کے مذہبی ٹھیکداروں پر چوٹ کی اور معاشرے کو باور کرایا کہ خواتین کے بھی اپنے مخصوص مسائل ہیں۔انھوں نے متوسط طبقہ کی خواتین کی ازدواجی زندگی میں رونما ہونے والے حادثات کو اپنے افسانوں میں جگہ دی اور ان کی ذہنی اور جسمانی اذیت کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی۔'انگارے' میں شائع ہونے والی تحریروں کو اس وقت ناپسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا گیا لیکن انھوں نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

"ممتاز شیریں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا لیکن ان کی مقبولیت ایک خاتون نقاد ہونے کی وجہ سے زیادہ ہوئی۔ تخلیق اور تنقید دونوں میں انھوں نے نمایاں مقام حاصل کیا۔ممتاز شیریں کے افسانے میں انسانی نفسیات کی گہری عکاسی ملتی ہے۔ان کے افسانوں میں تنوع موجود ہے لیکن ان کا انداز والہانہ ہے۔ممتاز شیریں کے زیادہ تر افسانے میاں بیوی کے رشتے ،ان کی آپسی محبت،ازدواجی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو ظاہر کرتے ہیں"

ممتاز شیریں کی پیدائش 12 ستمبر 1924 کو قصبہ بندو پور آندھرا پردیش میں ہوئی۔والد کا نام قاضی محمد عبدالغفور تھا۔ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔اس کے بعد انھیں اسکول میں داخل کرایا گیا۔تیرہ سال کی عمر میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد 1961 میں مہارانی کالج بنگلور سے بی۔اے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔23 اگست 1942 کو صمد شاہین سے ان کی شادی ہوگئی۔1954 میں انھوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم۔اے کیا۔اپنے شوہر کی ملازمت کے دوران انھوں نے بیرونی ممالک کا سفر کیا۔1967 میں اسلام آباد میں مکمل سکونت اختیار کرلی۔11 مارچ 1973 کو اس دارفانی کو الوداع کہا۔

ممتاز شیریں فکشن کی تنقید میں اہم مقام رکھتی ہیں۔ان کا پہلا افسانہ 'انگڑائی' ہے جو رسالہ 'ساقی' (دہلی) میں شائع ہوا۔یہ افسانہ بہت مقبول ہوا اور ممتاز شیریں کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی۔ان کے شوہر صمد شاہین 'نیا دور' نکالتے تھے،جس کی وجہ سے وہ کافی مشہور ہو چکے تھے لیکن جب صمد شاہین کو ملازمت کے سلسلے میں یوروپ جانا پڑا تو یہ رسالہ بند ہو گیا۔ممتاز شیریں کا پہلا تنقیدی مضمون '1943 کے افسانے' نیا دور کے پہلے شمارے اگست ستمبر 1966 میں شائع ہوا۔ستمبر 1947 میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'اپنی نگریا' محمد حسن عسکری کے دیباچے کے ساتھ مکتبہ جدید لاہور سے شائع ہوا۔اس مجموعے میں چھ افسانے شامل ہیں جس میں آئینہ،انگڑائی،گھنیری بدلیوں میں،اپنی نگریا،رانی اور شکست ہیں۔دوسرا مجموعہ میگھ ملہار 1962 میں شائع ہوا جو بہت مقبول ہوا۔

ممتاز شیریں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا لیکن ان کی مقبولیت ایک خاتون نقاد ہونے کی وجہ سے زیادہ ہوئی۔تخلیق اور تنقید دونوں میں انھوں نے نمایاں مقام حاصل کیا۔ممتاز شیریں کے افسانے میں انسانی نفسیات کی گہری عکاسی ملتی ہے۔ان کے افسانوں میں تنوع موجود ہے لیکن ان کا انداز والہانہ ہے۔ممتاز شیریں کے زیادہ تر افسانے میاں بیوی کے رشتے ،ان کی آپسی محبت،ازدواجی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کو ظاہر کرتے ہیں۔ان کے افسانوں کے متعلق ڈاکٹر ابوبکر عباد اپنی کتاب 'ممتاز شیریں: ناقد کہانی کار' میں لکھتے ہیں:

> ''ممتاز شیریں کے افسانوں کا اہم اور دلچسپ موضوع نفسیات ہے۔چنانچہ ''انگڑائی''، ''آئینہ'' اور ''شکست'' میں انھوں نے انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ پیش کیا ہے۔ان افسانوں میں انھوں نے کرداروں کے ظاہر سے زیادہ ان کے باطن پر توجہ دی ہے۔''انگڑائی'' اور ''آئینہ'' میں کالج کے نوجوان لڑکیوں کو نفسیاتی تبدیلیوں سے گزرتے دکھایا گیا ہے اور ''شکست'' میں یہ تبدیلی ایک معمر شخص کے اندر ہوتی ہے۔اول الذکر دو افسانے متوسط طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں اور 'شکست' کو نچلے طبقے کی زندگی پس منظر فراہم کرتی ہے۔

(ابوبکر عباد،ممتاز شیریں: ناقد،کہانی کار،ایجوکیشنل پبلی شنگ ہاؤس،دہلی 2006،ص:42)

'انگڑائی' ان کا وہ پہلا افسانہ ہے جسے غیر معمولی شہرت نصیب ہوئی۔اس افسانے میں انھوں نے عمر کی اس منزل اور اس کے تقاضوں پر

واضح روشنی ڈالی ہے جب ایک لڑکی سن بلوغ کو پہنچتی ہے۔اس افسانے میں جو کردار ہے وہ ایک لڑکی کا ہے جس کا نام گلنار ہے اور جو اپنے کالج کی ہی ٹیچر فنانس سے محبت کر بیٹھتی ہے لیکن اظہار نہیں کر پاتی۔ بہت جلد اس کی شادی پرویز نام کے لڑکے سے کر دی جاتی ہے۔گلنار کی زندگی میں پرویز کے آتے ہی بہار آجاتی ہے اور وہ اپنی اس محبت کو جو کہ اس نے کالج کے دنوں میں اپنی ٹیچر سے کی تھی، کو تقریباً بھلا چکی ہے۔ پرویز کا اس کی زندگی میں داخل ہونا اس کے لیے بہت معنی رکھتا ہے۔گلنار کی شادی جب پرویز سے ہو جاتی ہے تو گلنار کی محبت اس کے لیے شدید تر ہو جاتی ہے۔ یہ تبدیلی ہی دراصل 'انگڑائی' افسانہ کی جان ہے۔عنفوان شباب میں کہ جب گلنار کالج جایا کرتی تھی اس وقت اس کا اپنی ٹیچر کے تئیں جو محبت کا رویہ تھا وہ پاگلوں جیسا تھا لیکن جیسے ہی اس کی شادی ہوئی اور ازدواجی زندگی شروع ہوئی تب گلنار کو اس بات کا اندازہ ہوا کہ جو جذبات اس کے دل میں اپنی ٹیچر کے لیے تھے وہ محبت نہیں تھی بلکہ ایک فطری عمل تھا۔ وہ اپنی شادی شدہ زندگی سے بہت خوش ہوتی ہے اور تب وہ یہ سمجھ پاتی ہے کہ لڑکی سے ماں بننے کا جو خواب ہوتا ہے وہ ہم جنس رشتے سے کبھی پورا نہیں ہو سکتا بلکہ جنس مخالف سے ہوتا ہے۔اس افسانے میں ممتاز شیریں نے عورت کی نفسیاتی فطرت کو واضح کیا ہے اور یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ عورت کا عورت سے پیار ایک اخلاقی عمل ہے۔عبارت دیکھیں:

''گلنار آخر تمھیں ہو کیا گیا ہے؟'' میں نے چونک کر دیکھا۔ امی کھڑی تھیں۔ان کا چہرہ غصہ سے تمتما رہا تھا۔''مس فنانس کب سے تمھارا انتظار کر رہی ہیں۔ تمھیں کچھ پاس بھی ہے بڑوں کا۔اور وہ تو تمھاری استانی ہیں۔'' امی بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔

''تمھارا انتظار کر رہی ہیں۔ تمھیں کو یاد کر رہی ہیں۔ تمھارے نام کی رٹ لگا رکھی ہے۔'' اچھا بھئی جاؤں گی..... ہاں، کیوں نہیں؟ ضرور جاؤں گی۔ یہ ساڑی پہن کر جو میرے پرویز نے لا کر دی ہے۔اور ہاں وہ انگوٹھی بھی پہنوں گی جو پرویز سے میرے منسوب ہونے کی نشانی ہے۔''

(انگڑائی، اپنی نگریا، مکتبہ جدید لاہور، 1947ء، ص:82)

ممتاز شیریں کے افسانوں میں جنسی ناہمواریاں بھی نظر آتی ہیں۔ اس سلسلے کی ایک اہم کڑی 'دیپک راگ' ہے۔ دیپک راگ ان کا ایسا افسانہ ہے جس میں نسوانی لہجہ اور احساس نظر آتا ہے۔اس افسانے میں انھوں نے عورت اور مرد کے رشتے کو مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔'دیپک راگ' میں جہاں عزیز، ممتاز اور زبیری ہیں تو وہیں کملا، چمپا، کسم، اور پرمیلا جیسی لڑکیاں بھی موجود ہوتی ہیں۔ یہ تمام کردار جنسی رشتوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ان رشتوں میں جنسی لذت کے ساتھ ساتھ حسن و دلکشی بھی موجود ہے۔ممتاز شیریں کے اس افسانے کی زبان بھی ان کے دیگر افسانوں سے خاصی مختلف ہے۔

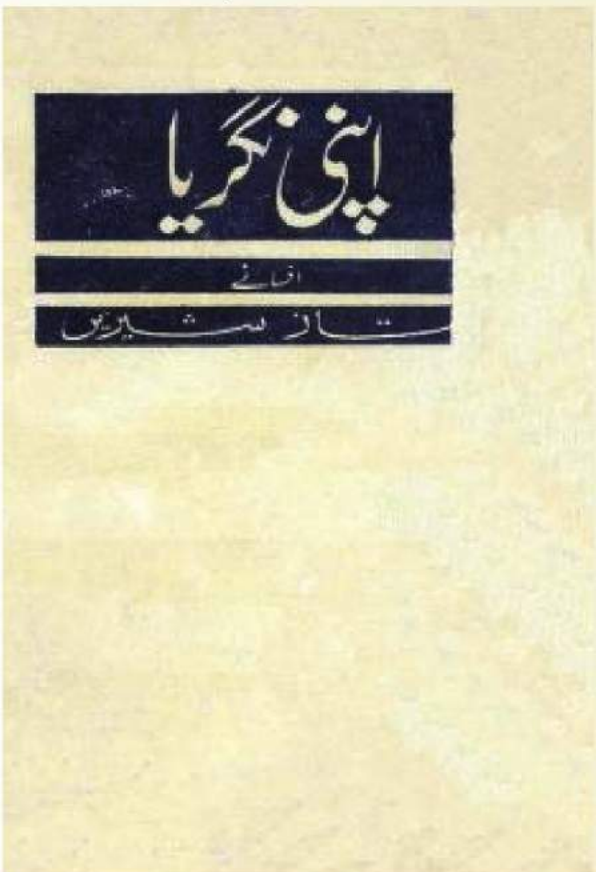

ممتاز شیریں کے یہاں کوئی ایسا ناصحانہ تصور نظر نہیں آتا جس سے واضح ہو سکے کہ وہ خواتین کے بارے میں مرد اساسی نظام کے خلاف سینہ سپر ہیں۔ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جس زمانہ میں انھوں نے افسانے لکھنے کی شروعات کی اس وقت تک افسانے کا کوئی واضح تصور ان کے ذہن میں نہیں تھا۔ان کے افسانے لکھنے کا مقصد اصلاح معاشرت نہیں ہے۔ پروفیسر وہاب اشرفی ممتاز شیریں کو تانیثیت کی رہبر خواتین کی صف میں نہیں رکھتے۔ان کا ماننا ہے کہ:

''ممتاز شیریں کو ان معنوں میں تانیثیت کی رہبر خواتین کی صف میں نہیں رکھا جا سکتا جس صف میں وہ بیباک مصنفہ ہیں جنھوں نے اپنی نگارشات سے مرد اساسی نظام کے خلاف بگل بجا دیا ہے، لیکن ایسا نہیں ہے کہ وہ عورتوں کی محرومی کی

خبر نہیں رکھتی ہیں، دراصل ان کے یہاں فنی رکھ رکھاؤ کی کیفیت سب سے زیادہ نمایاں رہی ہے، لہٰذا وہ اپنے آپ کو Contain کرتی ہیں، انہیں پدرسری سماج میں عورتوں کا جس طرح استحصال ہوتا ہے اس کی کلی خبر ہے لیکن وہ بانگ دہل اس کے خلاف صف آرا نہیں ہوتی ہیں لیکن جس طرح انھوں نے اپنے حوالے ہی سے بعض متعلقہ امور کی نشاندہی کی ہے ان کا تجزیہ کیا جائے تو اس ضمن میں ان کا کرب صاف جھلکتا دکھائی دے گا۔ لہٰذا ان کی دھیمی اور غایت سنجیدہ آواز فیمی نزم کی ایک کڑی ہے، لیکن وہ اپنے جذبات اور احساسات پر پہرے بٹھانا جانتی ہیں لہٰذا ان کے یہاں انقلابی للکار نہیں ہے، جو بھی ہے وہ داخلی ہے اور فنی دائرے میں ہے، لہٰذا اس ضمن میں بھی ان کا امتیاز روشن ہے۔''

(وہاب اشرفی، عالمی تحریک نسائیت مضمرات و ممکنات، وہاب اشرفی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی 2012، ص 282-281)

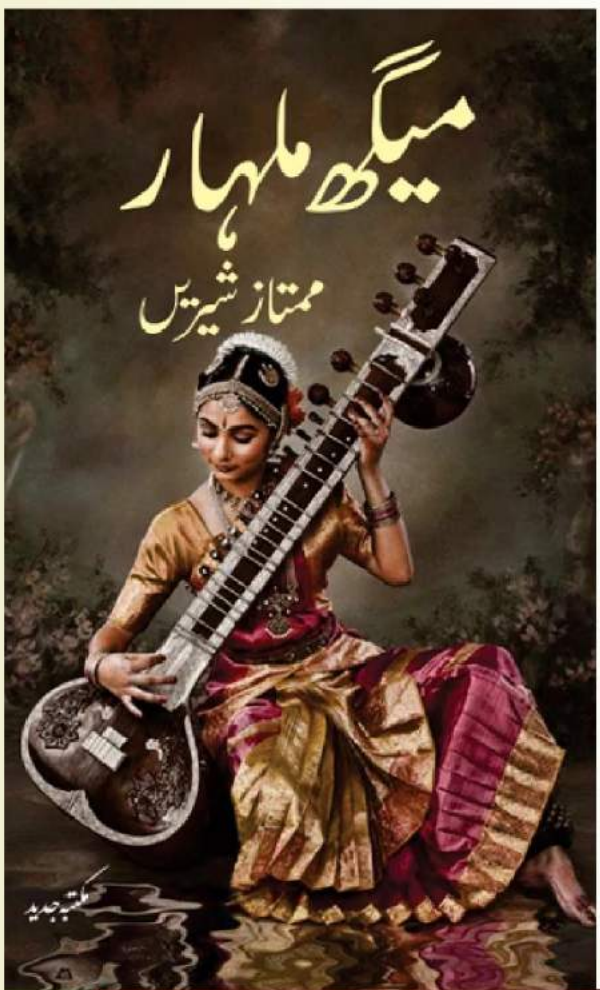

ممتاز شیریں کے افسانوں میں فکر و شعور کی گہرائی، انسانی نفسیات کی تصویر کشی اور دردمندی نظر آتی ہے۔ انسانی نفسیات کی ترجمانی ان کے افسانوں میں بیشتر مقامات پر نظر آتی ہے۔ چاہے وہ 'میگھ ملہار' کے افسانوں میں ہوں یا 'اپنی نگریا' کے۔ انھوں نے بہت زیادہ افسانے نہیں لکھے لیکن جو لکھے ہیں وہ بے حد اہم اور معنی خیز ہیں۔

''اپنی نگریا کے بیشتر افسانے ابتدائے بلوغیت کی تخلیق ہیں۔ چنانچہ انگڑائی، آئینہ اور گھنیری بدلیوں میں یہ تینوں افسانے سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں لکھے گئے.....اب اس سے اتنا آگے نکل آنے کے بعد پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو مجھے یہی محسوس ہوتا ہے کہ شاید یہ افسانے اسی دور میں لکھے جانے چاہیے بھی تھے چنانچہ انگڑائی اگر میں اب لکھتی تو ممکن ہے کہ اس میں پختہ کاری ہوتی لیکن یقیناً وہ تازگی، شگفتگی وہ فطری بے ساختگی نہ آنے پاتی۔'' (اپنی نگریا)

اپنے افسانوں کے ذریعے انھوں نے دوشیزہ، کمسن اور نوعمر کی لڑکیوں کے جذبات کی تصویر کشی کی ہے۔ نہ تو ان کا فن کسی کے اوپر الزام تراشی کرتا ہے اور نہ ہی وہ اپنے افسانوں کے ذریعے کسی بہت بڑے انقلاب کی متمنی نظر آتی ہیں۔ اپنے افسانوں کو انھوں نے میڈیم کے طور پر منتخب کیا ہے اور ایک ایسے معاشرے کو ہمارے سامنے پیش کیا جس میں رہنے والے ہر طبقے کے لوگ ہیں۔ خواتین پر ان کے بیشتر افسانے مبنی ہیں۔ ان کے یہاں باغیانہ لہجہ اور مردوں سے نفرت کا شائبہ تک نہیں ہے۔ سید محمد حسن عسکری 'اپنی نگریا' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''ان کے افسانوں میں بھی ان کے مطالعے کا گہرا اثر ملتا ہے۔ سب سے بڑی بات تو ممتاز شیریں کے افسانوں کی یہ ہے کہ اپنے افسانوں میں آب و رنگ پیدا کرنے کے لیے انھوں نے کبھی سنسنی خیزی یا جنسی اور سیاسی اشتعال انگیزی کی کوشش کبھی نہیں کی۔ آج کل نئی افسانہ نگار خواتین میں یہ مرض وبا کی طرح پھیل رہا ہے کہ جنسیات کے متعلق کوئی بات بالکل منہ پھٹ طریقے سے کہہ دی جائے جس سے لوگ چونک پڑیں کہ ارے لڑکی ہو کے اتنی بے حیائی! غرض کہ لکھنے والیوں کو شہرت کا بڑا ٹکا حاصل ہو گیا ہے، ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ اپنی دانست میں یہ لوگ عصمت چغتائی کی پیروی کرتی ہیں، مگر یہ عصمت کی سی فن کاری اور فنی سنجیدگی کہاں سے لا سکتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افسانہ محض ایک

پٹاخہ بن کے رہ جاتا ہے۔اوراب تو یہ جنسی پٹاخہ بہت ہی سیل ہوگیا ہے۔لیکن ممتاز شیریں نے ایسی ہوسنا کی سے اپنا دامن کبھی آلودہ نہیں ہونے دیا بلکہ ان کا طرز عمل ہمیشہ اس کے بالکل بر خلاف رہا ہے۔ حالانکہ ان کے ایک افسانے یعنی ''انگڑائی'' میں تو براہ راست میلان ہم جنسی کا ذکر ہے لیکن اس موضوع کی تمام ترغیبات کا ممتاز شیریں نے بڑی دلاوی سے مقابلہ کیا ہے۔

(دیباچہ اپنی نگریا، ممتاز شیریں، ص:10-11)

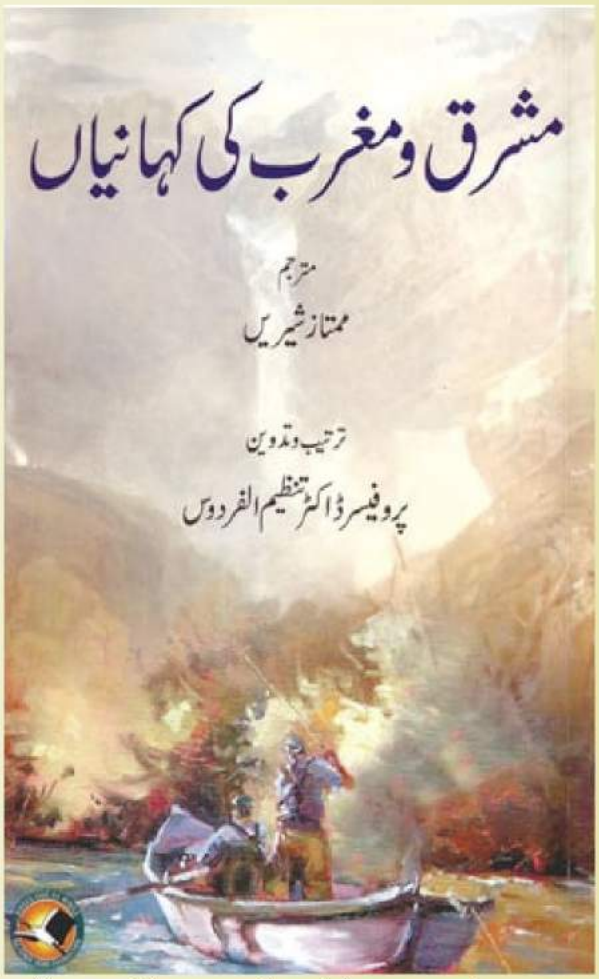

متاز شیریں نے انسانی نفسیات کو ذہن میں رکھ کر افسانے تحریر کیے۔ان کے افسانے ان کی خود کی زندگی کے داخلی تجربات ہیں۔کہیں کہیں انھوں نے جنسی بے اعتدالیوں پر بھی چوٹ کی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے جنسی ناہمورایوں پر طنز نہیں کیا ہے ۔کچھ افسانوں کے کردار روایتی بھی معلوم ہوتے ہیں لیکن وہ افسانوں میں بے جا سنسنی پیدا کرنے سے گریز کرتی ہیں۔ زبان کی سادگی بھی افسانے میں ایک کیف پیدا کرتی ہے۔

کفارہ کا جو مرکزی کردار ہے وہ ایک حاملہ خاتون ہے اور اسپتال میں ایک بستر پر موجود ہے۔افسانے میں جو کردار ہے وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں خواب دیکھتی ہے۔خواب میں وہ ادھر ادھر بھٹک رہی ہے۔اسے اپنی کوئی منزل نظر نہیں آتی ہے اور وہ مسلسل بھٹکتی ہی رہتی ہے۔ہوسکتا ہے یہ ممتاز شیریں ہی ہوں یا ہمارے ہندوستانی سماج کی کوئی عورت ہو جو ماں بننے کے درد سے گزر رہی ہو،اس درد کو محسوس کر رہی ہو:

''میں نے آنکھیں بند کرلیں اور موت کا انتظار کرتی رہی۔
میری زندگی سبک دوش ہوکر دوبارہ مرگ کا انتظار کرتی رہی۔
چنانچہ مجھے مرنا تھا۔ ایک بے معنی اور بے مصرف زندگی
ناگہاں اپنے اختتام کو پہنچ جائے گی میں نے زندگی میں کوئی
معرکہ سر نہیں کیا، کسی چیز کی تخلیق نہیں کی۔کوئی ایسا کام نہیں کیا
جو میری اب تک کی زندگی کا کوئی جواز بن سکتا لیکن اب ایک
نئی زندگی کی تخلیق شاید میری زندگی کا جواز بن جائے۔(کفارہ)

'کفارہ' کو ان کی اہم کہانی قرار دیا جاسکتا ہے۔شدت تاثر کی وجہ سے اس افسانہ کو عمدہ افسانہ کہا جاسکتا ہے۔ مذکورہ افسانہ میں عورت دردزہ سے تڑپ رہی ہے۔ اس افسانے میں عورت ایک مردہ بچے کو جنم دیتی ہے۔عورت تخلیق کے مرحلے سے گزرتی ہے اور اپنے بطن سے نئے وجود کو جنم دیتی ہے۔ماں بن کر عورت تمام گناہوں سے پاک ہوجاتی ہے اور اس کا وجود مقدس اور پاکیزہ ہوجاتا ہے۔

'گھنیری بدلیوں میں' انھوں نے شادی شدہ زندگی کا عکس ابھارا ہے۔یہ ایک ایسی لڑکی کی کہانی ہے جو اپنے شوہر سے بے پناہ محبت کرتی ہے اور ماں بن چکی ہے۔بیوی شوہر پرست ہے لیکن تنہائی کا غم اس کو بہت ستاتا ہے۔بیوی کی تڑپ اور بے چینی اس افسانے میں نمایاں ہوکر سامنے آئی ہے:

''اس کے کانوں میں وہ مانوس آواز آئی۔وہ پیاری آواز۔
اسے جمیل کی آواز سے بھی کتنی محبت تھی۔جب کبھی وہ باہر سے
آکر دروازہ کھولنے کے لیے آواز دیتا۔اس کا دل دھڑکنے لگتا
تھا۔اس کی رگ رگ میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی۔لیکن آج وہ
اتنی خوش نہ ہوسکی۔اس کے دل کو اس پیہم کسک نے اتنا مسل
دیا تھا کہ وہ کھل ہی نہ سکتا تھا۔اس کی خوشی اتنی دھیمی تھی جیسے
کہیں دور گھنیرے بادلوں کی تہوں میں بجلی کی چمک دکھائی
دے۔''(گھنیری بدلیوں میں)

''اس عمر کی لڑکیوں کی اٹھان بھی عجیب ہوتی ہے۔اس عمر کی لڑکیاں پکا نرم پھل نہیں ہوتیں بلکہ چٹپٹی، ترش، کچی کیری سی اور تازہ کچی کیری کو دیکھ کر رال ٹپک پڑتی ہے نا؟.....اس عمر میں ان کی جنسی حس ابھی ابھی جاگی ہوتی ہے اور جنس سے متعلق ان کا جذبۂ تجسس اس قدر بڑھا ہوتا ہے۔''

ممتاز شیریں نے فنکارانہ انداز میں خواتین کی داخلی اور خارجی حسن کی تصویر کشی کی ہے۔ان عبارتوں میں افسانہ نگار نے جو لفظیات استعمال کی ہے وہ اس سے پہلے کسی اور افسانہ نگار کے یہاں نظر نہیں آتی۔زبان کی چاشنی سے انھوں نے اپنے افسانوں میں نیا پن پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے عورت اور مرد کے مابین جنسی رشتوں کی ایسی تصویر کشی کی ہے جو عورت اور مرد کے فطری تقاضوں کو پیش کرتی ہے۔

آئینہ ان کا اہم افسانہ ہے۔اس افسانے کا اہم کردار نانی بی ہیں جو ادھیڑ عمر کی عورت ہیں۔نانی بی کی زندگی کے اردگرد ہی یہ افسانہ گھومتا ہے۔لڑکی نانی بی سے بہت مانوس نظر آتی ہے اور نانی بی سے پر تجسس انداز میں آئینہ کے بارے میں پوچھتی ہے۔اس کی یہ بات سن کر نانی بی شرما جاتی ہیں۔کچھ وقت کے بعد نانی بی اس گھر سے چلی جاتی ہیں اور لڑکی بھی جوان ہوکر شادی کے بارے میں سوچنے لگتی ہے۔اس دوران وہ نانی بی کو تقریباً بھلا چکی ہوتی ہے کہ اچانک ایک دن نانی بی کے انتقال کی خبر اس کو ملتی ہے تو وہ رنجیدہ ہو جاتی ہے۔کل ملا کر دیکھا جائے تو نانی بی ہی اس افسانے کا اہم کردار ہے۔اقتباس دیکھیں:

''آہ! انھوں نے ایسا ہی آئینہ میرے لیے منگوایا تھا۔''

''ایسا آئینہ کس نے منگوایا تھا نانی بی؟'' وہی ہمارے گھر والے، ہمارے آدمی۔'' تمھارے گھر والے کون نانی بی۔'' وہی بجرگوں نے جن سے میرا بیاہ کیا تھا۔''''تو تمھارا بیاہ ہوا تھا نانی بی۔ باجے بجے تھے، تمھارے بیاہ میں؟ اور تم نے اچھے اچھے کپڑے اور زیور پہنے تھے۔ اپنے بیاہ کا قصہ سناؤ نانی بی، آج اوئی اللہ میں تو شرم سے پانی پانی ہوگئی۔'' (آئینہ)

ممتاز شیریں نے اپنے افسانوں میں بیشتر مقامات پر جنس کے بارے میں لکھا ہے اور اس کا موازنہ کیا ہے۔ازدواجی زندگی، عورت کی گھٹن اس کے احساسات و جذبات کو ممتاز شیریں نے اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔وہ انسانی نفسیات کو پیش کرنے میں ماہر نظر آتی ہیں۔ان کا مشاہدہ وسیع ہے۔ان کے زیادہ تر افسانوں کو ان کے مشاہدہ کی بنیاد پر ہی پرکھا جا سکتا ہے۔ان کے افسانوں کے کردار اردگرد کی زندگی اور اس میں رونما ہونے والے حادثات ہیں۔ممتاز شیریں افسانوں کے کرداروں کے ذریعے جنسی رشتوں کے بارے میں اپنی فکر ظاہر کرتی ہیں۔

'رانی' افسانہ بھی فنی نقطۂ نظر سے کمزور افسانہ ہے۔اس میں انھوں نے سیٹھ ساہوکاروں کے ظلم و جبر کی داستان قلم بند کی ہے۔اس افسانے میں بظاہر تو کوئی ایسی خاص بات نظر نہیں آتی لیکن بباطن میں انھوں نے انسان کی داخلی زندگی کا خاکہ موثر انداز میں پیش کیا ہے۔

'اپنی نگریا' کے بیشتر افسانے ایک حساس لڑکی کے ذہن کی پیداوار ہیں۔فنی نقطۂ نظر سے ان کے افسانے کمزور ہیں لیکن وہ افسانوں میں تجسس پیدا کرنے سے گریز کرتی ہیں۔انھوں نے ابتدا میں جو افسانے تحریر کیے اس میں کچا پن تو ہے لیکن یہ بھی افسانے میں حسن پیدا کرتے ہیں۔اپنی نگریا کے بیشتر افسانوں میں نوعمر کی لڑکی کی داستان قلمبند ہوئی ہے۔اپنے افسانوں کے تعلق سے لکھتی ہیں:

''کسی مقصد یا شعوری کوشش سے زیادہ حساس اور وجدان میرے افسانوں کا محرک ہوتا ہے، تکنیک میں کوئی تجربہ کرنے کا خیال بھی میرے کسی افسانہ کا محرک نہیں ہوا۔ یہ الگ بات ہے کہ میرا ہر افسانہ الگ تکنیک میں ہے اور یہ بات اتنی غیر شعوری بھی نہیں لیکن موضوع چننے، مواد کو ذہن میں جمع کرنے، افسانے کی تفصیلیں، پلاٹ و واقعات یہ سب سوچنے سے پہلے میں نے کبھی تکنیک کا خیال نہیں کیا۔'' (اپنی نگریا، مکتبہ جدید لاہور، ص:234)

ممتاز شیریں نے اگرچہ بہت کم افسانے لکھے لیکن جو لکھے وہ بیحد اہم اور معلوماتی ہیں۔ان کے ذہن میں باقاعدہ طور پر افسانے کا کوئی تصور نہیں تھا لیکن ہیئت اور تکنیک کے اعتبار سے ان کے افسانے اہمیت کے حامل ہیں۔افسانوں کا ذکر کیے بغیر اردو افسانہ نگاری کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔

□□□

Dr. Musarrat
Delhi

شاعرات کے منتخب اشعار

کر دیا باد خزاں نے خاک سارا گلستاں
لب ہلے ہی تھے کلی کے مسکرانے کے لیے

کسی کا نام سن کر ضبط کے باوصف پہروں تک
مرے بے نور چہرے کی درخشانی نہیں جاتی
صفیہ شمیم

مرے نصیب میں لکھی تھی کیوں شب فرقت
رقیب نے مرے، اللہ شرمسار کیا

بس کہ ترے بن چین نہیں ہے
چاہت کی حد کیسے پاؤں
رابعہ سلطانہ ناشاد

دوب پہ بکھرے شبنم موتی ڈر ڈر کے ہم پاؤں دھریں
جیسے کسی نے من بکھرائے ہوں سبزے پہ کالوں کے

شمع کی لو محرابوں میں پروانوں کی پرچھائیں
تصویر ادراک ہے جیسے چاند پہ سائے ہالوں کے
سعیدہ عروج مظہر

یہ درود عشق کا قصہ جو تیرے نام کروں
شروع کیسے کروں اور کہاں تمام کروں

مجھے اک شوق ایسا دے مجھے اک درد ایسا دے
جو تیرا مبتلا کر دے جو راز عشق سمجھا دے
بیگم رضیہ حلیم جنگ

گلوں سی گفتگو کریں قیامتوں کے درمیاں
ہم ایسے لوگ اب ملیں حکایتوں کے درمیاں

میں آندھیوں کے پاس تلاش صبا میں ہوں
تم مجھ سے پوچھتے ہو مرا حوصلہ کیا ہے
ادا جعفری

زندگی نے کیا دیا ہے مجھ کو اک غم کے سوا
زندگی میں رنگ بھرنے کب سے مسکاتی ہوں میں

جب بھی قاتل نے لگائی ضرب کاری ایک اور
اور جینے کے تقاضے معتبر ہوتے گئے
زبیدہ تحسین

کیوں ساری حقیقتوں کا چہرہ
اک چادر وہم سے ڈھکا ہے

کیوں نیند میں لوگ چل رہے ہیں
یہ کیسا ہجوم بے صدا ہے
زہرا نگاہ

وہ ترے دیدہ و لب کی کیفیتیں
رنگ اور نور کا جیسے چشمہ رواں

لے گئیں لوٹ کر ساز و سامان دل
ایک لمحے کی جاں سوز برنائیاں
ساجدہ زیدی

ایم اے کنول جعفری

اعلیٰ تعلیم میں خواتین کی حصہ داری

اعلیٰ تعلیم میں خواتین کی حصہ داری کی بات کریں تو 2019-20 میں مرکزی تعلیمی اِدارے سی بی ایس ای کے انٹر میڈیٹ کے امتحان میں 88.78 فیصدی طالب علم کامیاب ہوئے۔ان میں 92.15 فیصدی لڑکیاں اور 86.19 فیصدی لڑکے شامل ہیں۔ہائی اسکول میں پاس ہونے والے 91.46 فیصدی طلبہ میں 93.3 فیصدی لڑکیاں اور 90.14 فیصدی لڑکے ہیں۔2018-19 میں انٹر میڈیٹ میں 83.40 فیصدی طالب علم پاس ہوئے تھے۔ان میں 88.70 فیصدی لڑکیاں اور 79.40 فیصدی لڑکے تھے۔2020 میں رِم جھم (99%) 2019 میں ہنسکا شکلا (99.8%)، 2018 میں میگھنا شریواستو (99.8%)، 2017 میں رکشا گویل (99.6%)، 2016 میں سُکرتی گپتا (99.4%) اور 2015 میں ایم گایتری (99.2%) نے (سبھی لڑکیاں) ٹاپ کیا۔لیکن اعلیٰ تعلیم میں یہ لڑکیاں پیچھے رہیں۔آئی سی ایس ای اور صوبائی تعلیمی بورڈوں کے ہائی اسکول اور انٹر میڈیٹ کے امتحانات کے نتیجے بھی کم و بیش ایسے ہی رہے۔کیا یہ ورودھابھاس نہیں ہے۔2019 کی یو پی ایس سی امتحانات میں کامیاب ہونے والے 829 طلبہ میں پرتبھا ورما تیسرے مقام پر رہیں، جبکہ، پردیپ سنگھ نے پہلی اور جتن کشور نے دوسری پوزیشن حاصل کی۔ پہلے 10 میں وشاکھا یادو (چھٹویں) اور سُنیتا مہاپاترا (دسویں) مقام پر رہیں۔

گزشتہ رکارڈ دیکھیں، تو 2018 میں 577 لڑکے اور 182 لڑکیوں، 2017 میں 750 لڑکے اور 240 لڑکیوں، 2016 میں 846 لڑکے اور 253 لڑکیوں، 2015 میں 229 لڑکیوں، 2014 میں 950 لڑکے اور 286 لڑکیوں، 2013 میں 861 لڑکے اور 261 لڑکیوں اور 2012 میں 753 لڑکے اور 245 لڑکیوں نے یو پی ایس سی کے امتحانات میں شاندار کامیابی حاصل کی۔لیکن لڑکوں کے مقابلے یہ تناسب بہت کم ہے۔اتنا ہی نہیں اگر پہلے 10 مقام پر رہنے والے طلبہ کی بات کریں تو 2019، 2018 اور 2017 میں تین تین، 2016 میں چار، 2015 میں دو، 2014 میں سب سے زیادہ چھ خواتین

خصوصی مقام بنانے میں کامیاب رہیں۔آخر کے تین برسوں میں یہ کامیابی صرف تین تین خواتین کے حصے میں آئی۔کیا اسے تضاد نہیں کہا جائے گا؟انٹرمیڈیٹ تک لڑکوں سے بازی جیتتی آ رہی لڑکیوں کی اعلیٰ سطح پر ناکامی پر غور وفکر کی ضرورت ہے۔آل انڈیا اعلیٰ تعلیم جائزہ رپورٹ کے اعداد وشمار کے مطابق 2017 میں جن 3.6 کروڑ طلبہ وطالبات نے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں داخلہ لیا تھا،ان میں طالبات کی تعداد محض 1.7 کروڑ تھی۔بورڈ امتحانات میں سبقت لے جانے والی لڑکیاں،اعلیٰ تعلیم میں لڑکوں کے مقابلہ 47.6 فیصدی کم رہیں۔20 لاکھ لڑکیوں کا اعلیٰ تعلیم کی سیڑھی پر قدم نہ رکھنا تشویش ناک ہے۔درج فہرست ذات کا فیصد 21.8 ہے،جبکہ درج فہرست قبائل کا تناسب صرف 15.9 فیصد ہے۔

مرد وخواتین کو مساوی اختیارات حاصل ہونے والے ملک میں اسے باعث تفکر ہی کہا جائے گا کہ تعلیم کی سطح جیسے جیسے اعلیٰ ہوتی جارتی ہے،ویسے ویسے یہ فرق کم ہوتا نظر نہیں آتا۔اعلیٰ اور تحقیقاتی تعلیم تک یہ امتیاز اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔2017-2018 کی جائزہ رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ ملک میں پی ایچ ڈی حاصل کرنے والوں کی کل تعداد 34 ہزار میں 20,179 لڑکے اور 14,221 لڑکیاں شامل تھیں۔یعنی طالبات کی تعداد طالب علموں سے 5958 کم۔لڑکیوں کے اس کم ہوتے تناسب کو نیک فال نہیں کہا جاسکتا۔قومی سطح کے اداروں میں طالبات کی تعداد دیگر تعلیم گاہوں کی بہ نسبت کم پائی گئی۔انٹرمیڈیٹ تک اپنی لیاقت کا پرچم بلند رکھنے میں کامیاب طالبات کے اعلیٰ اور تحقیقاتی عمل میں پیچھے رہنے کی بات سمجھ سے بالاتر ہے۔'بیٹی بچاؤ،بیٹی پڑھاؤ' کا خواب شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے والدین کو لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔49 فیصدی والدین بچوں کو قابل بنانے کے لیے اضافی گھنٹے کام کے علاوہ ایک سے زائد نوکری کرتے دیکھے جاتے ہیں۔ایچ ایس بی سی کے عالمی جائزے میں ہندوستان کی 15 ریاستوں میں 10 ہزار والدین اور 1500 طلبا وطالبات سے معلومات کے بعد تیار رپورٹ کے اعداد وشمار میں بتاتے ہیں کہ 84 فیصدی والدین اپنی آمدنی کا بڑا حصہ بچوں کی یونیورسٹی کی تعلیم پر خرچ کرتے ہیں،جبکہ 41 فیصد ماں باپ تعلیم کے لیے بچت کرنے کو ضروری نہیں مانتے۔بین الاقوامی سطح پر 53 فیصدی والدین بچوں کی اعلیٰ تعلیم کی خاطر اپنی تفریحی سرگرمیوں میں کٹوتی کرتے ہیں،41 فیصدی چھٹیاں کم لیتے ہیں اور 35 فیصدی ماں باپ اضافی کام یا دوسری نوکریاں کرتے ہیں۔ہندوستان میں 60 فیصدی والدین تفریحی سرگرمیوں میں تخفیف کرتے ہیں،59 فیصدی چھٹیاں کم لیتے ہیں اور 29 فیصدی اضافی یا پارٹ ٹائم جاب کرتے ہیں۔وہ اپنے بچوں کے نصاب پر اوسطاً 3,81,138 روپے خرچ کرتے ہیں۔اتنا ہی نہیں 35 فیصدی سے 64 فیصدی کے درمیان ماں باپ اپنے بیٹے بیٹیوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے دوسروں کے مقروض ہو جاتے ہیں۔

تعلیمی امتیاز سے واقفیت کے لیے سال 2011 میں جائزہ کی شروعات کی گئی۔اس کا واحد مقصد ملک میں اعلیٰ تعلیم کا اطمینان بخش اور قابلِ یقین ڈیٹا بیس تیار کرنا تھا،تاکہ اعلیٰ تعلیمی سطح کا جائزہ لے کر نئی اور سود مند پالیسیاں تیار کی جاسکیں۔گزشتہ برسوں کی جائزہ رپورٹ سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے کالجوں میں داخلہ لینے والوں کی تعداد میں لگاتار اضافہ ہوا۔اس کی ایک وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ پچھلے کچھ سالوں میں اعلیٰ تعلیم دینے والے اداروں کی تعداد بڑھی ہے۔اعلیٰ تعلیم کی سہولت مہیا کرانے کے لیے جہاں نئے ادارے کھل رہے ہیں،وہیں پُرانے کالجوں میں سیٹوں کی تعداد بڑھائی جارہی ہے۔چھ برس پہلے تک اعلیٰ تعلیم کے لیے داخلہ لینے والے طلبہ وطالبات کی تعداد قریب 3 کروڑ تھی۔پانچ سال قبل یہ تعداد بڑھ کر 3.5 کروڑ تک پہنچ گئی اور اب 10 کروڑ سے بھی اُوپر ہے۔ملک کی آبادی اور اقتصادی پالیسی کی ضرورتوں کے نظریہ سے یہ اضافہ ناکافی ہے۔جائزہ رپورٹ پر غور کریں تو اعلیٰ تعلیم کے دائرے میں ابھی بہت کچھ کیا جانا باقی ہے۔خواتین کے معاملے میں تو اور بھی زیادہ سنجیدہ ہونے اور کھلے ذہن سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

اسکولی سطح پر پرچم بلند رکھنے والی طالبات کی تعداد اعلیٰ، تکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیم تک آتے آتے کم ہو جاتی ہے۔ ماہرین تعلیم اس کے پیچھے سماجی اور اقتصادی وجوہات کے علاوہ سرکار کی جانب سے ملنے والے پروتساہن میں کمی کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ این سی ای آر ٹی کے سابق ڈائریکٹر اور قومی اساتذہ تعلیمی بورڈ (این سی ٹی ای) کے سابق صدر پروفیسر جے ایس راجپوت کا خیال ہے کہ 66-1964 کے دوران نیشنل کمیشن آف ایجوکیشن (کوٹھاری کمیشن) کی 1968 کی رپورٹ کی سفارش میں لڑکیوں کے لیے سائنس اور حساب کی تعلیم کو لازمی کیا گیا، لیکن رپورٹ نافذ کرنے میں لمبا وقت لگ گیا۔ اس بابت پہلی بار مدھیہ پردیش میں امتحانات ہوئے۔ اسی وجہ سے لڑکیوں کو ترقی کے راستے پر گامزن ہونے کے لیے مزید وقت لگنا ناگزیر تھا۔ باوجود اس کے شہروں میں رفتہ رفتہ ہر دائرے میں لڑکیوں کا عمل دخل بڑھ رہا ہے، مگر گاؤں میں معاشرتی دباؤ کی وجہ سے ایسا رجحان نہیں ہے۔ حالانکہ ان کی تعداد میں بھی کسی حد تک اضافہ دیکھا جا رہا ہے۔

قابل غور ہے کہ نصف صدی قبل تک عام لوگوں کا رجحان تعلیم کی طرف نہیں تھا۔ جہاں تک تعلیم نسواں کا سوال ہے، تو زیادہ تر لوگ اس جانب توجہ نہیں دیتے تھے۔ تعلیم یافتہ کہے جانے والے گھرانوں میں بھی لڑکیوں کی تعلیم کے تئیں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ لڑکیاں تعلیمی اداروں میں پڑھنا چاہتی تھیں، لیکن تعلیم سے کوسوں دُور رہنے والی ان لڑکیوں کا درد جاننے والا کوئی نہیں تھا۔ اگر کسی لڑکی کو تعلیم کی اجازت مل بھی جاتی، تو اُسے اِس کے لیے کافی مشقت کرنی پڑتی تھی۔ شہر میں تو ایک دو پرائمری و جونیئر ہائی اسکول ہوتے تھے۔ قریب 80 فیصدی گاؤں و دیہاتوں میں بنیادی تعلیم دینے والے اسکولوں کا فقدان تھا۔ لڑکوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے کئی کلومیٹر پیدل چل کر شہر یا قصبہ کے اسکول میں جانا پڑتا تھا۔ غربت او رتنگ حالی کی وجہ سے عام کسان و مزدوروں کا ایک بڑا طبقہ اپنے لڑکوں سے کھیتی باڑی اور مزدوری کرا کر دو وقت کی روٹی مہیا کرنے کے جُگاڑ میں رہتا تھا۔ لڑکیوں کے لیے علیحدہ سے اسکولوں کا بندوبست نہیں ہونے سے ان کے لیے تعلیم کے دروازے قریب قریب بند سے تھے۔ ماں باپ کا اپنی بیٹیوں کو شہر و قصبات میں بھیجنا تو دُور، وہ ان کے گھر سے باہر نکلنے کے حق میں بھی نہیں تھے۔ تعلیم یافتہ لوگوں کی کمی کے سبب زیادہ تر افراد کی ذہنیت نسوانی تعلیم کے خلاف تھی۔ ان کی سوچ تھی کہ لڑکے پڑھ لکھ کر خاندان کا سہارا بن سکتے ہیں، لیکن لڑکیوں کو امور خانہ کی ذمہ داری ہی سنبھالنی ہے۔ انھیں گھر میں رہ کر کنبہ کی تعلیم یافتہ خواتین سے قرآن شریف پڑھنے یا محلّہ کی مسجد سے ملحق مدرسہ میں دینی تعلیم حاصل کرنے کی رعایت تھی۔

تعلیم کی اہمیت سے واقف ہونے والے والدین بھی اپنی بیٹیوں کو گریجویشن کے بعد تعلیم دلانے کے حق میں نہیں ہو کر ان کی شادی کو ترجیح دیتے ہیں۔ تعلیمی رفتار تیز ہونے کے باوجود معاشرے میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے، جو بے راہ روی کے خوف سے لڑکیوں کو آگے پڑھانے سے گریز کرتے ہیں۔ درحقیقت ایسے لوگ لاشعوری کے اندھیرے میں بھٹک رہے ہوتے ہیں۔ لڑکیوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے میں رُکاوٹ کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ کئی مائیں اپنے بیٹوں کے لیے کم عمر، خوبصورت اور معمولی تعلیم یافتہ لڑکیوں کو ترجیح دیتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کمسن اور کم پڑھی لکھی لڑکیاں سسرال کے طور طریقوں سے جلدی واقف ہو کر خود کو وہاں کے ماحول میں آسانی سے ڈھال سکتی ہیں۔ کئی والدین دختران کی اعلیٰ تعلیم کو اس لیے آمادہ نہیں ہوتے کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان کی قابلیت کے لحاظ سے مطلوب رشتہ تلاش کرنے میں دشواری آتی ہے۔ کئی بار بی ایڈ، پی ایچ ڈی یا ایم فل لڑکی کے لیے موزوں رشتہ نہیں ملا اور کم پڑھے لکھے لڑکے سے شادی کو مجبور ہونا پڑا۔ اس طرح کے معاملوں میں اکثر زوجین کے مابین تلخی رہی اور نوبت طلاق تک جا پہنچی۔ کچھ لوگ ایسی شادی کو مثال بنا کر اعلیٰ تعلیم کی خواہش کا گلا گھونٹنے لگے۔

آخر کار وقت نے کروٹ بدلی۔ تعلیمی بیداری مہم اور اس سے متعلقہ پروگراموں کے انعقاد نے اس جمود کو توڑا۔ لڑکیوں کی تعلیم کو معیوب سمجھے جانے والے معاشرے میں لڑکیوں کی بنیادی تعلیم کے لیے الگ سے اسکول کھولے گئے۔ بعد میں یکسانیت کا فارمولہ نافذ ہونے سے باہمی تعلیم دی جانے لگی۔ اَب تعلیم نسواں کے لیے کسی طرح کی رُکاوٹ نہیں ہے۔ ہر مذہب و فرقے کی لڑکیاں مقامی اسکولوں میں پرائمری اور جونیئر ہائی اسکول کی تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ اپنی استطاعت کے مطابق گاؤں اور قریبی شہروں کی تعلیم گاہوں سے ہائی اسکول و انٹرمیڈیٹ کی پڑھائی آسانی سے پوری کر لیتی ہیں۔ یہ بات بہت حد تک سکون دینے والی ہے کہ اب شہروں کی طرح دیہات کی لڑکیاں بھی تعلیمی مواقع کا فائدہ اُٹھا کر گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کر رہی ہیں۔ اتنا ہی نہیں اعلیٰ تعلیم کی بدولت کتنی ہی خواتین تعلیم، صحت، سیاست، سیاحت، صحافت، عدلیہ، تجربات، ڈاک، کوہ پیمائی، پولیس، فوج، نیوی، ہوائی، جاسوسی، ڈرائیونگ، انجینئرنگ، بازار، الیکٹرونک اور خلائی خدمات کے علاوہ سبھی طرح کے دفاتر میں اپنے فرائض کو بخوبی انجام دے کر ملک کی ترقی و بہبود میں تعاون دے رہی ہیں۔

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ قوم و معاشرے کی تعمیر و ترقی کا انحصار ہمارے تعلیمی نظام پر ہے۔ تعلیم و تربیت میں انسانی شعور کو جلا بخشنے کی زبردست قوت پوشیدہ ہے۔ کسی قوم کی ترقی میں تعلیم کی اہمیت کا اندازہ اس کی شرح خواندگی سے بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے۔ دُنیا میں اپنی بالا دستی رکھنے والے ممالک امریکہ، برطانیہ، آسٹریلیا، کناڈا، فرانس و جرمنی کی شرح خواندگی 99 فیصدی ہے، جبکہ ناروے 100 فیصد، روس 99.6 فیصد اور قزاقستان 99.5 فیصد ہے۔ دُور اندیشی کا مظاہرہ کرنے والے ممالک کی خاص بات یہ بھی ہے کہ تعلیم کے معاملے میں خواتین مردوں سے بالکل پیچھے نہیں ہیں۔ کہیں کہیں تو ان سے آگے ہیں۔ غربت سے دُوبدو ہوتے ان ممالک میں خواتین کی شرح خواندگی اور بھی ابتر ہے۔ ٹکنالوجی کے شعبہ میں لگاتار آگے قدم بڑھانے والے ہمارے ملک ہندوستان میں 2001 کی مردم شماری کے اعداد و شمار میں شرح خواندگی 64.8 فیصد درج ہے۔ طبقاتی اعتبار سے اقلیتوں میں عیسائیوں کی شرح خواندگی سب سے زیادہ 80.3 فیصد ہے۔ بودھ 72.7 فیصد اور سکھ 69.4 فیصد ہیں، جبکہ مسلمانوں کی شرح خواندگی سب سے کم 59.1 فیصد ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں عیسائی، بودھ اور سکھوں کی خوشحالی کا سبب ان کی بہتر خواندگی ہے، وہیں پسماندہ طبقات اور مسلمانوں کے پیچھے رہنے کی اہم وجہ ان کی تعلیم سے دُوری ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں تعلیم یافتہ مسلم خواتین کی شرح 53.7 فیصد ہے۔ ان میں بھی زیادہ تر خواتین حرف شناسی تک محدود ہیں۔ سات سال سے 16 برس تک عمر کی اسکول جانے والی لڑکیوں کی شرح 3.11 فیصد ہے۔ شہری علاقوں میں 4.3 فیصد اور دیہی علاقوں میں 2.26 فیصد لڑکیاں ہی اسکول جاتی ہیں۔ 1948 میں شہری علاقوں میں پرائمری تعلیم کی شرح 13.9 اور دیہی علاقوں میں 4.0 فیصد تھی، جو 2001 میں بڑھ کر شہری علاقوں میں 70.9 فیصد اور دیہی علاقوں میں 47.8 فیصد ہوگئی۔ 1948 میں آٹھویں درجہ کی تعلیم حاصل کرنے والی لڑکیوں کی شرح 5.2 فیصد اور دیہی علاقوں میں 0.9 فیصد تھی، جو 2001 میں بڑھ کر شہروں میں 51.1 فیصد اور دیہات میں 29.4 فیصد ہوگئی۔ 2001 میں میٹرک تک کی تعلیم حاصل کرنے والی لڑکیوں کی شہری علاقوں میں شرح 32.2 فیصد اور دیہات میں 11.2 فیصد رہی۔ جہاں تک روزگار کا سوال ہے، تو صرف 25.2 فیصد مسلم خواتین ہی روزگار سے جڑی ہیں، جبکہ ہندو خواتین کی شرح روزگار 46.1 فیصد ہے۔

مسلمانوں کا تعلیم کے تئیں بیدار ہونا اور لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کو بھی تعلیم دلانے میں کسی طرح کا حیلہ بہانہ نہیں کرنا نیک شگون ہے، لیکن یہ بات بھی کم تکلیف دہ نہیں ہے کہ مسلم لڑکیاں غیر مسلموں کی بہ نسبت ہر سطح پر اسکول چھوڑنے میں سب سے آگے ہیں۔ 19 مارچ 2018 کو پارلیمنٹ میں انسانی وسائل فلاح و بہبود اسٹیٹ منسٹر اُپیندر کشواہا کے ذریعہ دئے گئے بیانیہ میں پرائمری سطح پر اسکول چھوڑنے والی طالبات کی شرح 4.13 فیصد تھی۔ ان میں درج فہرست ذات کی لڑکیاں 4.46 فیصد، درج فہرست قبائل کی 6.93 فیصد اور مسلم لڑکیوں کی شرح 6.54 فیصد ہے۔ جونیئر ہائی اسکول میں اسکول چھوڑنے والی کُل 4.03 فیصد لڑکیوں میں درج فہرست ذات کی لڑکیاں 5.51 فیصد، درج فہرست قبائل 8.59 فیصد اور مسلم لڑکیوں کی شرح 9.49 فیصد ہیں۔ ہائر سیکنڈری سطح کی تعلیم میں اسکول ڈراپ آؤٹ کرنے والی لڑکیوں کی شرح 17.06 فیصد ہے۔ ان میں درج فہرست ذات کی لڑکیاں 19.36 فیصد، درج فہرست قبائل کی 24.68 فیصد اور مسلم لڑکیوں کی شرح 24.12 فیصد کو کسی بھی صورت میں صحیح نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

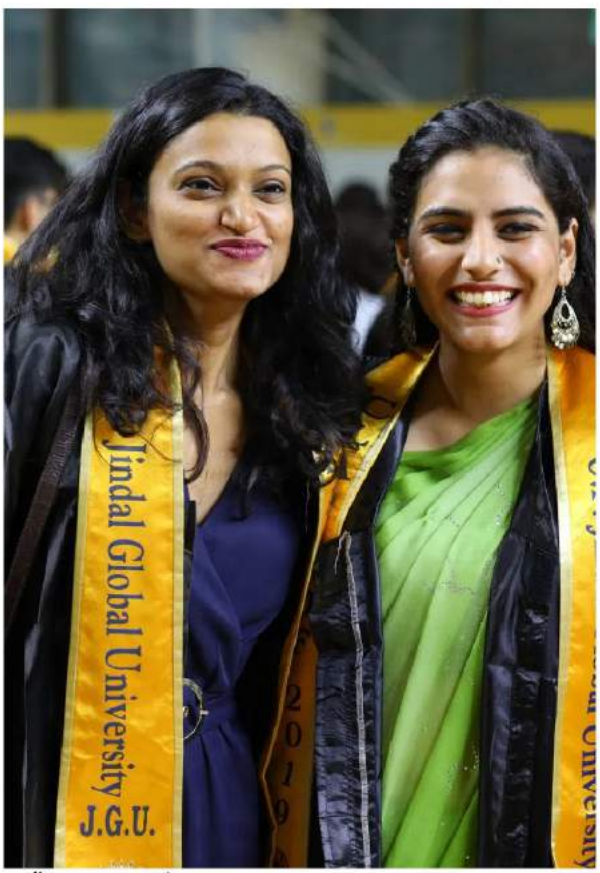

ہندوستان میں 1947 میں شرح خواندگی 12 فیصد تھی، جو 2011 کی مردم شماری میں اضافہ کے ساتھ 74.04 فیصد ہوگئی۔ جس میں مردوں کا تناسب 82.14 اور خواتین کا 65.46 فیصد ہے۔

نومبر 2006 میں راجندر پرساد سچر کمیٹی کے ذریعہ جاری کی گئی رپورٹ کے مطابق ہندوستان کی شرح خواندگی 65 فیصد ہے۔اس میں مردوں کا تناسب 75.3 فیصد اور عورتوں کا تناسب 53.7 فیصد ہے۔قومی سطح پر مسلمانوں کی شرح خواندگی 59.1 فیصد ہے۔شہری علاقوں میں مسلمانوں کی شرح خواندگی 68 فیصد اور دیہی علاقوں میں 50 فیصد ہے۔خواتین کی شرح خواندگی 59 فیصد ہے۔افسوس ناک بات یہ ہے کہ قومی سطح کے ایک جائزے کے مطابق پرائمری (ابتدائی) تعلیم میں مسلم طالبات کی شمولیت صرف 35 فیصد ہے۔جونیئر ہائی اسکول میں قریب 50 فیصد لڑکیاں تعلیم چھوڑ کر گھر بیٹھ جاتی ہیں۔باقی طالبات بھی ہائی اسکول تک پہنچتے پہنچتے صرف 10 فیصد رہ جاتی ہیں۔انٹر میڈیٹ تک یہ تناسب اور بھی کم ہو کر صرف تین فیصد رہ جاتا ہے۔جہاں تک اعلیٰ تعلیم کا تعلق ہے، تو گریجویٹ میں مسلمانوں کی تعداد صرف 6.3 فیصد اور پوسٹ گریجویٹ میں چار فیصد ہے۔تحقیقاتی امور (پی ایچ ڈی) میں یہ تعداد 5.4 فیصد ہے۔حالانکہ ہندوستان میں اعلیٰ معیار کے محققین کی خاصی کمی ہے۔ڈاکٹریٹ اور تحقیقی سطح پر کام کرنے والوں کی تعداد نسبتاً کم ہے۔آبادی کے لحاظ سے دنیا کے سب سے بڑے ملک چین میں ہر سال سائنس اور انجینئرنگ کے شعبوں میں پی ایچ ڈی کرنے والے اسکالروں کی تعداد قریب 30 ہزار اور امریکہ میں 25 ہزار ہے، جبکہ ہندوستان میں یہ تعداد صرف 4500 ہی ہے۔

کہنا غلط نہ ہوگا کہ خواندگی کے معاملے میں اب تک ملک کے پیچھے رہنے کی اہم وجہ اقلیتوں اور پسماندہ طبقات کی تعلیم سے دُوری ہے۔خاص طور سے خواتین مردوں سے بہت پیچھے ہیں۔ناخواندگی کو بڑھاوا دینے میں معاشی حالات بھی اہم وجہ ہیں۔نوجوان روزگار کے لیے پریشان ہیں۔بزرگ و اطفال عدم غذائیت سے پیدا ہونے والی بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ایسی صورت حال میں دو وقت کی روٹی حاصل کرنے اور طرح طرح کے امراض سے نبرد آزما ہونے والے لوگ ملک کے تعمیراتی کام میں اپنا تعاون نہیں دے سکتے۔غربت دُور کرنے اور بے روزگاری کے خاتمے کے لیے ہم سرکاروں کو بھلے ہی کوستے رہیں، لیکن تعلیم کے معاملہ میں سرکار کو موردِ الزام ٹھہرانا مناسب نہیں ہے۔اب تعلیم کی اہمیت وافادیت کے مدِ نظر سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی جانب سے مثبت قدم اُٹھاتے ہوئے نئی اسکیمیں شروع کی جارہی ہیں اور بیداری مہم کے تحت متعدد پروگراموں کا انعقاد کر عوام کو بیدار بھی کیا جارہا ہے۔اس اقدام سے روزگار کے مواقع بڑھے ہیں۔لوگوں کا طرزِ زندگی بدلا ہے اور تعلیمی معیار میں بھی اضافہ ہوا ہے۔تعلیم نسواں کے لیے سرکاری سطح پر کئی اسکیمیں چل رہی ہیں۔بیدار اور متحرک ہو کر ان سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔اقلیتی طبقات کو تعلیمی سطح پر مضبوط بنانے اور اُنھیں روزگار سے جوڑنے کے لیے وزارت برائے اقلیتی امور کی جانب سے وظائف، فیلوشپ اور مفت تکنیکی تعلیم پر مبنی متعدد منصوبے چلائے جارہے ہیں۔وزارت تعلیم کے ذریعہ بھی تعلیم کو گھر گھر تک پہنچانے کے مقصد سے کئی مفید اسکیمیں شروع کی گئی ہیں۔لوگوں کو اپنے ذہن سے یہ بات نکالنی ہوگی کہ وہ بے روزگار ہونے کی وجہ سے تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔

ترقی کے راستے پر گامزن رہنے اور دُنیا کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلم اداروں، مکاتب و مدارس وغیرہ میں انفارمیشن ٹکنالوجی کا قیام وقت کی اہم ضرورت ہے۔ماہرین تعلیم اور سماجی و سیاسی رہنماؤں کی ذمہ داری ہے کہ وہ تعلیمی، اقتصادی اور سماجی پسماندگی دُور کرنے والی سرکاری لائحۂ عمل اور ان سے فیض یاب ہونے کے آسان طریقوں سے عوام کو آگاہ کریں۔حکومت خواتین کے لیے الگ سے بھی کئی منصوبے چلا رہی ہے۔عورتوں کو اعلیٰ تعلیم یافتہ بنانا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کے ذریعہ تعلیمی شعبہ میں کام کرنے والے غیر سرکاری اداروں کو مالی تعاون تو فراہم کیا ہی جاتا ہے۔پوسٹ میٹرک تعلیم کے لیے اقلیتی طبقات سے تعلق رکھنے والی ہونہار طالبات کو مولانا آزاد قومی وظیفہ فراہم کیا جاتا ہے۔گریجویشن کرنے والی مسلم لڑکیوں کو 51 ہزار روپے بطور 'شادی شگون' بھی دیے جاتے ہیں۔اس کا فائدہ غربت کے شکار خاندان کی ان لڑکیوں کو پہنچ سکتا ہے، جو معاشی حالت ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے میٹرک سے آگے کی تعلیم سے محروم رہ جاتی ہیں۔وظیفہ کی رقم بذریعہ چیک طالبہ کے اکاؤنٹ میں جمع کرائی جاتی ہے۔مرکزی حکومت نے نئی تعلیم پالیسی 2020 نافذ کی ہے۔اس میں جہاں 2030 تک 100 فیصدی بچوں کو اسکول میں داخل کرایا جائے گا، وہیں 2035 تک اعلیٰ تعلیم کے لیے رجسٹریشن 28.3 فیصدی سے بڑھا کر 50 فیصدی کرنے کا ہدف طے کیا گیا ہے۔کئی نصاب میں 3.5 کروڑ نئی سیٹیں جوڑی جائیں گی۔خواتین کو چاہئے کہ 34 برس بعد تبدیل کی جانے والی تعلیمی پالیسی سے بھرپور فائدہ اُٹھانے کے لیے خود کو تیار کریں۔

□□□

M. A. 'Kanwal' Jafri

127/2, Jama Masjid,

NEENDRU, Tehsil Dhampur

Distt. Bijnor-246761 (U.P)

ڈاکٹر حنا آفریں

'بارش سنگ' کا تجزیاتی مطالعہ

1980 کے آس پاس اردو ناول کا نیا دور شروع ہوتا ہے جو ہئیت میں تبدیلی، افادیت اور موضوعاتی سطح پر اختلافی مسائل اور تجربات کے حوالے سے اہم ہے۔ ناول کا یہ دور اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ اس میں فکشن نگاروں نے عالمی انسانی برادری کو ایک اکائی کی شکل میں دیکھا۔ آزادی کے بعد کے فکشن نگاروں میں عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، سعادت حسن منٹو، غلام عباس، قرۃ العین حیدر، خواجہ احمد عباس، عبدالصمد، عبداللہ حسین اوران کے بعد کی نسل میں قاضی عبدالستار، حسین الحق، نیر مسعود، اقبال مجید، جوگندر پال کے علاوہ ایک بڑا نام جیلانی بانو کا ہے۔

جیلانی بانو کی پیدائش 14 جولائی 1936 کو ضلع بدایوں میں ہوئی۔ ان کے والد علامہ حیرت بدایونی اردو، فارسی کے مشہور شاعر تھے۔ ذریعۂ معاش کے لیے بدایوں سے حیدرآباد منتقل ہوئے اور وہیں مستقل طور پر سکونت اختیار کی۔ نتیجتاً جیلانی بانو کی تعلیم و تربیت حیدرآباد جیسے تاریخی اور تہذیبی شہر میں ہوئی۔

جیلانی بانو نے باقاعدہ طور پر ادبی سفر کا آغاز 1954 میں لاہور سے نکلنے والے رسالہ 'ادبِ لطیف' میں شائع افسانہ 'موم کی مریم' سے کیا۔ انھوں نے افسانے، ناول، ڈرامے، انشائیے، تبصرے اور ترجمے کے علاوہ اخبار میں کالم بھی لکھے۔ ان کا پہلا ناول 'ایوانِ غزل' دہلی سے 1976 اور کراچی سے 1977 میں شائع ہوا۔ دوسرا ناول 'بارشِ سنگ' کراچی میں 1984 اور حیدرآباد میں 1985 میں اشاعت پذیر ہوا۔

جیلانی بانو نے جس دور میں اپنا ادبی سفر شروع کیا وہ ہندوستان کی آزادی کے فوراً بعد کا زمانہ تھا۔ ملک سیاسی، سماجی، معاشی اور معاشرتی بحران سے گزر رہا تھا۔ تاریخی شہروں کی تہذیبیں اور روایتیں دم توڑ رہی تھیں۔ حیدرآباد شہر کی بھی یہی صورتِ حال تھی۔ جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ ہو رہا تھا۔ کسانوں، مزدوروں کی تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں۔ پرانی اقدار ختم ہو رہی تھیں۔ نئی تہذیب کا رجحان عام ہو رہا تھا۔ ان تمام واقعات کو جیلانی بانو نے اپنے ناولوں کا موضوع بنایا۔ اسی کے ساتھ ان کے ناولوں میں موجودہ دور کی سیاسی عیاری، معاشرے کے محافظوں، دانشوروں اور مفکروں کی خودغرضی، دولت و اقتدار کے لیے کیے جانے والے غیر انسانی افعال، بے حسی، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے ساتھ ان کے اہلکاروں کی جھوٹی شان و شوکت، ظلم و جبر، عورتوں، مزدوروں، کسانوں کا استحصال وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔

جیلانی بانو نے اپنے ناول 'بارشِ سنگ' میں کہیں بھی زمانے کی وضاحت نہیں کی مگر ناول کے آغاز سے ہی تقسیم ہند سے قبل اور بعد کے سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشی حالات کی عکاسی صاف نظر آتی ہے۔ ملک میں غریبوں، مزدوروں اور عورتوں کی پسماندگی، عورتوں کا جنسی استحصال، فرسودہ رسم ورواج، توہم پرستی، نئی اور پرانی تہذیب وخیالات کے درمیان کشمکش، مشترکہ تہذیب و ثقافت، سیاسی وسماجی حالت، نئی نسلوں میں انقلاب و بغاوت کے جذبات، آزادی کے تصورات، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی عیاشی، ان کے ظلم و جبر، غریب کسانوں، مزدوروں اور عورتوں کے حالات ومسائل کا تفصیلی ذکر اس ناول میں کیا گیا ہے۔

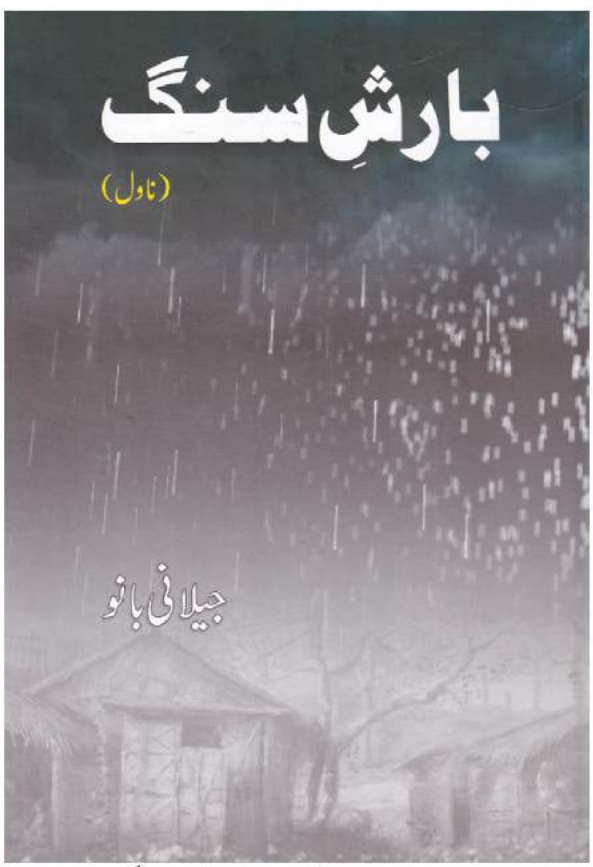

'بارشِ سنگ' ناول میں جاگیردارانہ طبقے کی نمائندگی وینکٹ ریڈی کا خاندان اور دلاور علی خاں کا خاندان کرتا ہے جبکہ مذہبی ریاکاری صابر میاں کے ذریعے کی جاتی ہے۔ مظلوم طبقے کی نمائندگی مستان کا خاندان کرتا ہے۔ جبر وظلم کے خلاف آواز بشیر اور نرسیا جیسے کردار اٹھاتے ہیں۔ مرکزی کردار سلیم ہے جو رہن مزدور مستان کا بیٹا ہے۔ وہ جاگیرداروں، نوابوں اور ساہوکاروں سے سخت نفرت کرتا ہے اور ان کے خلاف آواز بھی اٹھانا چاہتا ہے مگر مفلسی اور بے بسی کے سبب ایسا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اپنے اسی جذبے کے تحت وینکٹ ریڈی کی مظلوم اور کمسن بیوی رتنما سے اسے انسیت ہو جاتی ہے۔ وہ اس پر ہو رہے ظلم و جبر کو برداشت نہیں کر پاتا ہے اور بالآخر وینکٹ ریڈی کے چھوٹے بھائی ملیشیم ریڈی کا قتل کر دیتا ہے۔ نتیجے میں اسے پولس کی گولی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

'بارشِ سنگ' ناول کی شروعات فیض کی نظم 'آج کے نام۔۔۔۔' سے ہوتی ہے۔ یہ اس گاؤں کی کہانی ہے جو چیکٹ پلی یعنی اندھیر نگری کے نام سے مشہور ہے۔ آج اس گاؤں کے کھیتوں میں بیج پڑنے والا ہے۔ سلیم اس بات سے فکرمند ہے کہ اسی بیج سے صابر میاں، وینکٹ ریڈی اور دلاور علی خاں کے کھیتوں میں تو خوب اناج پیدا ہوتا مگر اس کے کھیتوں کی فصلیں کیوں سوکھی اور مرجھائی رہ جاتیں۔ جبکہ ہر غریب ہندو اور مسلمان کسان خالقِ حقیقی کی عبادت کے بعد بیج ڈالنے کا کام شروع کرتا ہے۔ دس گیارہ سال کے سلیم کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ ریڈی کے کھیتوں میں پڑنے والے بیجوں کو اپنے کھیتوں میں ڈالنے کا کام کیا جائے۔ بیج اٹھاتے وقت رکھوالے کے جاگ جانے پر اسے اس بات کا غم ہوا کہ بیج بھی نہیں ملے اور چوری کا الزام بھی لگا۔ سلیم کے دادا کے پاس سو (100) ایکڑ کھیت تھے جو اُن کے چھ بیٹوں میں تقسیم ہوئے اور ہر بیٹی کی شادی پر ایک کھیت وینکٹ ریڈی کے یہاں رہن رکھا گیا جسے وہ کبھی واپس نہیں لے سکے۔ اس طرح نسل در نسل سلیم کے خاندان کے لوگ ریڈی کے یہاں رہن ہوتے گئے۔ ریڈی کے گھر کے باسی کھانے سے سلیم کے گھر والے اپنا پیٹ پالنے لگے۔ سلیم اور اس کی ماں احمد بی، بہن خواجہ بی بھی ضرورت پڑنے پر اس گھر کا کام کرنے لگے۔ ایک دن وینکٹ ریڈی کی ہوس پرست نظریں سلیم کی بہن خواجہ بی پر پڑتی ہیں۔ اس کی درگت کے بعد سلیم کے والد مستان کا جو رویہ رہتا ہے وہ غور وفکر پر مجبور کرتا ہے۔ مثال دیکھیے:

'شام کو مستان خواجہ بی کو لانے ڈیوڑھی گیا تو وہ ایک کونے میں بے سدھ پڑی تھی۔ اس کی سرخ آنکھیں اور پھٹی ہوئی ساری نے اسے ہر بات بتائی۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس نے خواجہ بی کو سہارا دے کر اٹھایا۔

'باوا۔ باوا' خواجہ بی کلیجہ پھاڑ کر رو پڑی اور باپ سے لپٹ گئی۔

چپ بیٹا۔ چپ بیٹھ۔ لوگاں سن لیں گے۔ مستان ڈر کے مارے کانپ رہا تھا۔ اس نے خواجہ بی کی آنکھیں پوچھیں۔ کپڑے ٹھیک کیے۔

'امّاں کو کچھ نکو بول۔ تیرے بھائی سن لیں گے۔ سمجھ گئی نا۔ جا

اب تو خود گھر چلی جا۔ مجھے ریڈی کے ہاں بہت کام ہے۔'

(بارشِ سنگ از جیلانی بانو، ص 26 تا 27)

بیٹی کی ایسی حالت دیکھ کر مستان کو غصہ آنا چاہیے تھا مگر یہاں برعکس صورتِ حال نظر آتی ہے۔ وہ خود کو اتنا بے بس و مجبور محسوس کر رہا تھا کہ خواہش کے باوجود ریڈی کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا ہے۔ مستان، بیٹی سے خاموش رہنے کے لیے کہتا ہے کہ کہیں اس کے جوان بیٹے، ریڈی کے خلاف آواز اٹھانے کی پاداش میں معطوب نہ ہوں۔ وہ یہ خیال کر کے ریڈی کے خوف سے کانپ رہا تھا۔ غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ بیٹی کی عزت سے کھلواڑ کرنے والے کو سبق سکھانے کے بجائے مجبور و بے بس باپ اسی کے گھر کام کرنے چلا جاتا ہے۔ یہ واقعہ اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ ان غریبوں کا اس حد تک استحصال ہوا ہے کہ وہ استحصال کے خلاف آواز اٹھانے میں بھی ڈرتے تھے۔ کیوں کہ گاؤں میں کچھ ایسی مثالیں موجود تھیں جنھیں ریڈی کے خلاف آواز بلند کرنے پر مارا پیٹا گیا، پیڑ سے الٹا لٹکا دیا گیا، گدھے پر بٹھا کر پورے گاؤں میں گھمایا گیا، معاشرے میں اس کا بائکاٹ کیا گیا۔ مگر جب ایک دن اسی مستان کے صبر کا باندھ ٹوٹ جاتا ہے تو وہ خدمت گزار اور اُف نہ کرنے والا ملازم بیٹی کی عزت سے کھیلنے والے کا قتل کر دیتا ہے۔ اسے پھانسی کی سزا سنائی جاتی ہے۔ اس کے برعکس وینکٹ ریڈی کو رنگا ریڈی کے قتل کی پاداش میں کوئی سزا نہیں ملتی۔ معاشرے میں موجود نا انصافی اور پولس افسران کی رشوت خوری کی جانب بھی اشارہ موجود ہے۔

وینکٹ ریڈی کے قتل کے بعد اس کے بھائی ملیشیم ریڈی نے حیدرآباد تک یہ بات پھیلا دی کہ اس کے بھائی کا قتل 'اتحاد المسلمین' والوں نے کروایا ہے جس میں نواب دلاور علی خاں کا ہاتھ مانا جا رہا تھا۔ اس طرح ہندو مسلم فساد کو زور دیا گیا۔ چہار جانب ترنگے کو لہرانے کے لیے لوگ کوشاں تھے۔ اعلیٰ حضرت کا اقتدار بھی ڈانواڈول ہو رہا تھا۔ لوگ اتحاد المسلمین کے جلسوں میں شامل ہو کر اعلیٰ حضرت سے اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کر رہے تھے۔

صابر میاں جو چپے شاہ کی درگاہ کے مجاور تھے وہ اتحاد المسلمین کے صدر مقرر ہوئے۔ انھوں نے نواب دلاور علی خاں سے مسجد کے لیے کھیتوں کے قریب زمین لی۔ زمین کی کھدائی کے وقت ریڈی کے ملازم ملیگا نے اس میں لکشمی کی مورتی رکھ کر یہ خبر عام کر دی کہ یہاں مندر تھا۔ ایسا اس نے ریڈی کے اشارہ پر کیا۔ اس طرح ہندو مسلم فساد کو ہوا ملی اور جگہ جگہ فساد ہونے لگے۔ حکومت کے صوبے داروں اور تحصیلداروں کو تفتیش کے لیے گاؤں بھیجا گیا مگر انھوں نے بھی یہاں سوائے عیش کے کچھ نہ کیا۔ نرسیا کے بڑے بھائی رامیا کی بیوی رنگی کو اُن لوگوں نے ہوس کا شکار بنانا چاہا۔ نرسیا کے احتجاج کے سامنے اس وقت تحصیلدار کے آدمیوں کی کچھ نہ چلی مگر بعد میں اس کی بڑی درگت بنائی گئی۔ تصویر ملاحظہ ہو:

'کالک اور رنگ کے دھبّوں سے رنگے ہوئے گدھے پر نرسیا سوار تھا۔ اس کا سر موڈھ کر منھ کالا کیا گیا تھا اور پورے بدن پر چونے سے داغ ڈالے گئے تھے۔ اس کے دونوں ہاتھ رسّی سے بندھے ہوئے تھے اور ملیشیم کے نوکر گدھے کے پیچھے زور زور سے ڈھبرا بجا رہے تھے جس پر نرسیا سوار تھا۔

ساہوکار کے حکم کو نہ ماننے کی یہ سزا گاؤں میں کسانوں، مزدوروں کو دی جاتی تھی۔ یہ گاؤں کا بہت پرانا دستور تھا۔' (بارشِ سنگ، ص 109)

ظلم کے خلاف آواز اٹھانے پر نرسیا کو برادری سے باہر کر دیا گیا۔ اسے اب نہ کوئی بیٹی دے گا اور نہ ہی اس کی بیٹی کہیں بیاہی جائے گی۔ شادی بیاہ کے موقع پر نیوتے سے متعلق الاپچّی بھی اسے نہیں دی جائے گی۔ اس کی ماں، بہن کو کنوئیں سے پانی لینے کی بھی اجازت نہیں ہوگی۔ نرسیا کو ان سب باتوں سے معافی ملیشیم کے پیروں پر ناک رگڑنے سے مل سکتی تھی مگر نرسیا، بشیر علی سے مل جاتا ہے جو کرشنا پور گاؤں کے خوفناک ڈاکو سے مشہور تھا۔ ڈاکو بننے سے قبل اس کی بہن کی بھی عزت لوٹی گئی، اس کے کھیت جاگیردار نے چھین لیے اور گھر رضا کاروں نے لوٹ لیا، اس کی گردن پر بیلوں کا جوا رکھ کر رات بھر کھڑا کیا گیا تو پریشان ہو کر وہ ان ظالموں کے خلاف کھڑا ہو گیا۔

اِدھر سلیم اور اس کے کچھ ساتھیوں نے تحصیلدار کی ظلم و زیادتیوں سے پریشان ہو کر اس کے خلاف درخواست دے دی۔ جس کے سبب تفتیش کے لیے ایک کمیٹی قائم کی گئی اور شہر سے گاؤں ایک سرکاری وکیل کو اُن کے بیانات لینے کے لیے بھیجا گیا مگر وہاں موجود سرمایہ داروں کے سامنے گاؤں کے مظلوم لوگ کچھ کہہ نہ سکے۔ منظر دیکھیے:

'تمھارے پاس کھیت ہیں۔؟'

'نئیں سرکار۔۔۔۔

پہلے تھے صاب مگر ادھر پانچ سال پہلے پانی نہیں پڑا۔ میری بہنوں کی شادی کرنا تھی۔ بول کے نواب صاب کے پاس رہن رکھ دیا تھا صاب۔۔۔

خاجو نے تھوک نگل کر نواب صاب کی طرف دیکھا اور ان کی

آنکھوں کے جلال سے کانپ گیا۔

'پھر۔ پھر کچھ نہیں سرکار۔ خاجو گھبراہٹ میں ہاتھ ملنے لگا۔

اچھا تم بیٹھ جاؤ۔ اور کوئی ہے۔ سامنے آؤ۔۔۔۔

جی صاب میں رامیا ہوں۔ میں۔ ہی۔ اور رامیا کچھ کہنے سے پہلے رونے لگا۔

'ہاں ہاں بولو۔ کیا ہوا تمھارے ساتھ۔' وکیل صاحب نے نرمی سے پوچھا۔

'ہو۔ صاف صاف بتاؤ نا کہ تمھاری جورو کو کوئی تحصیلدار اٹھا کر لے گیا تھا۔ کیا تمہارے بھائی کو کسی نے قتل کر کے پھینک دیا ہے۔ کیا تمہاری زمین چھین لی ہے؟ کچھ بھی کہانی سناؤ نا وکیل صاب کو۔ بولتا کیوں نہیں گدھے'؟ ملیشیم نے چلّا کر کہا۔

رامیا، ملیشیم کی آواز سن کر گھبرا گیا۔ پیچھے سے اس کی بوڑھی ماں نے گھبرا کے اس کی دھوتی کا پلّہ کھینچا۔۔۔۔

صاب۔ میرا بھائی۔ بھائی۔ رامیا ہچکیاں لے رہا تھا۔۔۔۔

کیا ہوا اس کے بھائی کو۔ وکیل صاحب نے ملیشیم سے پوچھا۔۔۔۔

اس کا بھائی اپنا قرضہ چکائے بغیر گاؤں سے بھاگ گیا ہے۔ اب نہ یہ لوگ قرض واپس کرتے ہیں نہ اس کے بدلے کوئی دوسرا آدمی کام پر بھیج رہے ہیں۔۔۔۔

اچھا اب کوئی اور ہے۔'

میں آدی، ملیا، کشٹی، نارائنا، رالو، مراد، عبدل۔ مگر اپنے نام سے زیادہ وہ اور کچھ نہ کہہ سکے۔'

(بارشِ سنگ، ص123 تا125)

گاؤں والوں پر جاگیردار کا خوف اتنا طاری تھا کہ وہ اپنی آپ بیتی بھی بیان نہ کر سکے۔ سرمایہ داروں کا خوفناک چہرہ ان کے سامنے آجاتا اور خود کے ساتھ اپنے خاندان کے لوگوں پر گزرنے والی مصیبت کا خیال کر کے وہ کچھ بھی کہنے سے گریز کرتے۔ اس طرح ملیشیم کے ظلم وستم کے باوجود اس کے خلاف مقدمہ درج نہیں ہوتا اور سرکاری وکیل یوں ہی واپس چلا جاتا ہے۔

وینکٹ ریڈی کے قتل کے بعد ملیشیم ریڈی نے گاؤں کا سارا کاروبار سنبھال لیا تھا۔ ادھر خواجہ بی کا نکاح بھی کنکول گاؤں کے شابو کے ساتھ ہو گیا اور وہ رخصت ہو اپنے سسرال چلی گئی۔ رخصتی کے چھ مہینے بعد ہی وہ ایک بچے کی ماں بنی۔ اس کی ساس نے اس بچے کو اپنانے سے انکار کر دیا مگر شابو نے یہ کہہ کر اسے اپنا لیا کہ وہ بڑا ہو کر اس کے کام میں ہاتھ بٹائے گا۔ اس طرح اسے کام کرنے والے دو ہاتھ مل جائیں گے۔ وہ اپنی ماں کو سمجھاتے ہوئے کہتا ہے:

'سارا دن کھیتوں میں کام کر کے میرا قرض اُتار رہی ہے وہ۔
تم سب کا پیٹ بھرتی ہے۔ تھوڑے دنوں کے بعد یہ چھوکرا بڑا
ہو کر مزدوری کرے گا۔ تو چاہتی ہے کہ چار محنت کرنے والے
ہاتھ ٹوٹ جائیں۔ میں تو ساہو کے پاس رہن پڑا ہوں۔
بڈھی لاجواب ہو گئی۔۔۔۔ غریب کسانوں کے ہاں تو بچے
ہی دولت ہیں جو کسی خرچ کے بغیر ہی پل جاتے ہیں۔'

(بارشِ سنگ، ص138 تا139)

مصنفہ نے اس سفاک حقیقت کی جانب اشارہ کیا ہے کہ رہن مزدوروں کی کیسی بے بسی اور مجبوری ہے کہ اپنے گھر والوں کا پیٹ پالنے کے لیے انھیں ناجائز بچوں کو بھی اس امید پر اپنانا پڑ رہا ہے کہ بڑے ہو کر وہ ان کی مصیبتوں اور پریشانیوں کو کم کریں گے لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ان کی پریشانیاں دن بہ دن بڑھتی جاتی ہیں۔

ایک دن گاؤں میں یہ خبر آتی ہے کہ ہندوستان آزاد ہو گیا۔ یہ خبر سن کر چیکٹ پلّی گاؤں کے سبھی مرد اور عورتیں خوشی سے جھوم اٹھتی ہیں کہ اب انھیں کسی کی غلامی نہیں کرنا پڑے گی، ان کے کھیت انھیں واپس مل جائیں گے۔ ان کے گھر کی عورتوں کی عزت لوٹنے والوں کو جیل بھیجا جائے گا۔ یہی خیال کر کے وہ گاؤں سے کانگریس امیدوار پدا ریڈی کو ووٹ دیتے ہیں۔ اس کی جیت کی خوشی میں نکلنے والے جلوس میں سلیم آگے آگے رہتا ہے۔ مگر کافی وقت گزر جانے کے بعد بھی ان کے حالات تبدیل نہیں ہوتے۔ ملیشیم ریڈی کے گھر کا کام کرنے کے لیے اب سلیم کی بھابھی نورا کو بھی بھیج دیا گیا۔ جس نے پہلے کبھی کسی تحصیلدار یا جاگیردار کی چوکھٹ پر قدم نہیں رکھا تھا۔ وہاں اس کے ساتھ وہی ہوتا ہے جو اِس گھر کی بیٹی خواجہ بی کے ساتھ ہوا تھا۔ سلیم جب غصے میں ملیشیم ریڈی کے گھر جانا چاہتا ہے تو اسے نورا بھابھی کے ذریعہ یہ خبر ملتی ہے کہ وہ لوگ شہر چلے گئے ہیں اور رتنما اپنی مرضی کے بغیر شہر گئی ہے۔ سلیم شہر جا کر رتنما کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوانا چاہتا ہے مگر وہاں اسے کامیابی نہیں ملتی تو ایک اخبار کے دفتر پہنچتا ہے۔ وہاں بھی اسے ناکامی ہاتھ لگتی ہے۔

سلیم شہر میں بابو میاں کے گیرج میں ملازمت کر لیتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات مالن بی سے ہوتی ہے۔ جس کے منگیتر کو پولس اس لیے پکڑ

کر لے گئی کہ اس نے گاؤں کے ساہوکار کو مارا تھا۔ شہر میں اچانک سلیم کی ملاقات بشیر علی سے ہو جاتی ہے۔ سلیم اس سے اپنے دل کا حال کس طرح بیان کرتا ہے۔ یہ دیکھیے:

'میں شہر آیا تھا کہ کچھ محنت مزدوری کروں گا۔ مگر یہاں بھی سالے سب ملیشیم کے جیسے شیطان ہیں۔'

(بارشِ سنگ، ص188)

گاؤں اور شہر میں فرق یہ تھا کہ یہاں محض سرمایہ داروں کے نام اور رتبے تبدیل ہو گئے تھے۔ ظلم و ستم وہی تھے جو گاؤں میں تھے۔ بشیر علی کے متعلق مصنفہ یہ معلومات فراہم کرتی ہیں کہ:

'بشیر علی پانچ وقت نماز پڑھنے والا سیدھا سادھا سا نوجوان تھا مگر نظام کی پولس والوں نے اس کے بھائی کو اسی کے گھر کے سامنے پیڑ سے لٹکا کے پھانسی دی تھی۔ کیونکہ اس نے اپنی بیٹی کو اٹھا کر لے جانے والے جاگیردار کو لاٹھی سے مار کے ہلاک کر دیا تھا۔ بس، پھر بشیر علی انسان سے شیطان بن گیا'۔۔۔۔ مگر اپنے گاؤں میں وہ ایک ہیرو کی طرح یاد کیا جاتا تھا۔۔۔۔ اسے گرفتار کرنے پر پانچ ہزار کا انعام تھا مگر کتنی بار کتنے گاؤں میں لوگوں نے اسے پہچان لیا لیکن کسی کو پانچ ہزار کا انعام لینے کا خیال نہیں آیا۔'

(بارشِ سنگ، ص190تا191)

گاؤں والوں کو بشیر علی سے بہت امیدیں تھیں کہ وہ انھیں اس جہنم نما زندگی سے نجات دلوائے گا۔ عورتیں اس کی بہادری کے گیت گاتی تھیں کہ ان میں سے کوئی تو ایسا نکلا جو اِن سرمایہ داروں سے مقابلے کے لیے سامنے آیا ورنہ ان لوگوں میں اتنی ہمت ہی نہیں تھی۔

بشیر علی جس کا تعلق چھاپہ مار دستے سے تھا۔ سلیم اس کا رقعہ لے کر راحت صاحب کے پاس گیا۔ اس طرح وہ راحت صاحب کے ساتھ شہر میں ملیشیم کی ڈیوڑھی تک پہنچ گیا جہاں اس نے رتنما کو دیکھا جس کی تلاش میں وہ گاؤں سے شہر آیا تھا مگر یہاں وہ اس کے طور طریقے اور رہن سہن دیکھ کر نا امید ہوا۔ ملیشیم نے رتنما کو شہر میں اپنی بیوی کہہ کے متعارف کروایا تھا۔ سلیم نا امید ہو اپنے گاؤں واپس چلا جاتا ہے۔ وہاں اسی پرانے قانون کو دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ غریبوں کو اب بھی جاگیردار کے کھیتوں پر کام کرنا پڑتا۔ اس کے باوجود انھیں بھر پیٹ دو وقت کی روٹی بھی نہیں ملتی۔ سلیم کے گھر والے اس کو اس ڈر سے واپس شہر بھیج دیتے ہیں کہ وہ گاؤں میں محفوظ نہیں ہے۔

شہر میں سلیم کے سامنے یہ صورتِ حال پیش آتی ہے کہ کہ کوئی بھی لاری کا مالک اسے روپے لیے بغیر ملازمت دینے کے لیے راضی نہیں۔ مجبوراً وہ رکشہ چلانے کا کام کرتا ہے مگر یہاں بھی اسے چین و سکون میسر نہیں۔ کیوں کہ رکشہ کا مالک رات میں رکشہ میں شراب رکھ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ بھجواتا ہے۔ اسی بنا پر اسے گرفتار کر لیا گیا۔ جیل میں سلیم پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ اسے ٹی۔ بی کی مضر بیماری ہے۔ ایک دن رکشہ کا مالک سلیم کو ضمانت پر چھڑوا لیتا ہے تو وہ خوش ہونے کے بجائے افسردہ ہو جاتا ہے۔ جیل میں وہ اس بات سے مطمئن تھا کہ اس کے کھانے اور رہنے کا اچھا بندوبست ہو گیا تھا۔ صورت حال کی المناکی دیدنی ہے:

'اب جاؤ۔ تمھیں چھوڑ دیئے۔' لنگیا کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔

کیوں۔؟ کیوں چھوڑ دیئے۔؟ سلیم نے گھبرا کے پوچھا۔

یوں جیسے اسے عمر قید کی سزا کا کوئی حکم سنا رہا ہو۔'

(بارشِ سنگ، ص231)

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ سلیم اپنی رہائی پر خوش نہ ہو کر افسردہ ہے کیوں کہ اس کے نزدیک دو وقت کی روٹی اور رہنے کا مسئلہ درپیش ہے جو یہاں حل ہو گیا تھا۔ اب اسے رہنے اور کھانے کے لیے پھر سے جدوجہد کرنا پڑے گی۔

ایک دن سلیم یوں ہی رتنما کے گھر جاتا ہے۔ سلیم کے مطابق جس نے اپنے گھر کے دروازے سبھی کے لیے کھول دیئے تھے۔ مگر یہاں کا منظر دیکھ کر رتنما کے لیے اس کے جذبات ابھر آتے ہیں اور وہ بغیر سوچے سمجھے ملیشیم کا قتل کر دیتا ہے۔ تصویر دیکھیے:

'فریج میں سے کچھ نکالنے کے لیے رتنما کچن میں آئی تو پیچھے پیچھے ملیشیم آیا۔ اسے دیکھ کر سلیم کونے میں دبک گیا۔

'شریف صاحب آئے ہیں۔ میرا کام کرنے کا وعدہ کر رہے ہیں۔ بس! تمہاری مرضی چاہیے۔' اس نے آہستہ سے جھک کر رتنما سے کہا۔

'شریف کے ساتھ۔؟' فریج بند کر کے رتنما نے گھبرائی ہوئی نظروں سے ملیشیم کو دیکھا۔

'نہیں نہیں۔ مجھے اس کتے سے نفرت ہے۔' رتنما کو بہت غصہ آ رہا تھا۔

'تجھے تو ہر مرد سے نفرت ہے۔' ملیشیم نے رتنما کی کلائی پکڑ کے ایک تھپڑ مارا اس کے منھ پر۔ دوسرا تھپڑ مارنے والا ہاتھ

اوپر اٹھنے سے پہلے ہی نیچے گر پڑا۔ کیوں کہ سیب کاٹنے والا چاقو اس کے سینے کے آر پار ہو چکا تھا۔'

(بارشِ سنگ، ص245 تا246)

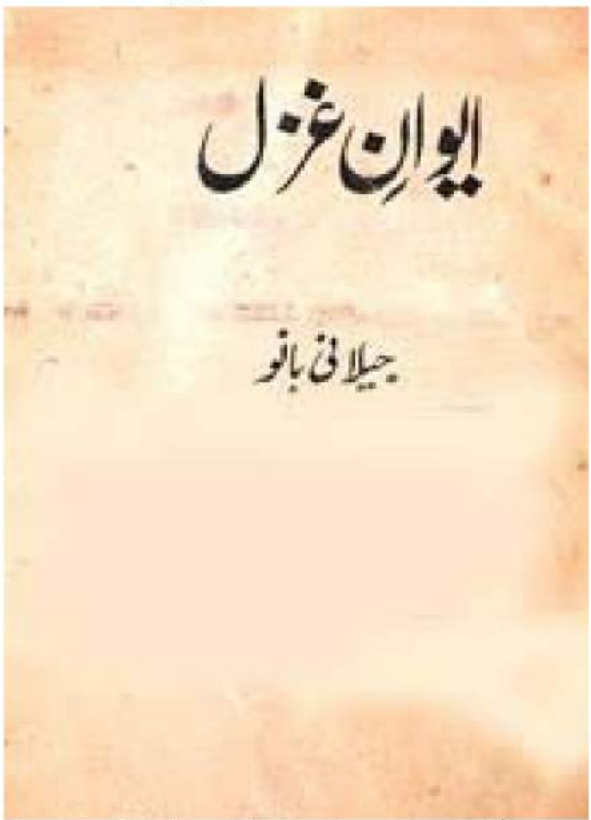

ملیشیم اور رتمما کے مکالموں سے سلیم کو رتمما کی سچائی معلوم ہو جاتی ہے اور وہ رتمما اور اپنی بہن، بھابھی کی عزت سے کھیلنے والے کو سبق سکھا دیتا ہے۔

ملیشیم شہر میں منسٹر بن چکا تھا۔ اس لیے اس کا قتل کرنے پر سلیم کو دہشت گرد قرار دیا گیا اور دیکھتے ہی گولی مار دینے کا حکم جاری کیا گیا۔ سلیم اپنی جان بچا کر گاؤں پہنچ جاتا ہے اور بڑے بھائی مراد کے ساتھ کھیت میں اس کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ وہاں نورا بھابھی کے ذریعہ جنمے ملیشیم کے بچے کو دیکھ اسے ملیشیم کا خیال آتا ہی ہے کہ اسی درمیان ایک پولس انسپیکٹر اسے کھیت میں گولی مار دیتا ہے کیوں کہ دہشت پسندوں کے گروہ سے ملے ہونے پر اسے گولی مار دینے کا حکم تھا۔ تبھی سلیم اپنی بھابھی سے کہتا ہے:

'مجھے یاں سے نکوا اٹھاؤ۔ میرا خون میرے کھیت میں بہنے دو۔'

سلیم نے دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام کے کہا۔۔۔۔

'بھابھی۔' اس نے ڈوبتی نظروں سے نورا کی طرف دیکھا۔

'بھابھی، اس بچے کو ملیشیم کے ہاں ضرور رہن رکھنا۔ یاد رکھنا یہ۔ بات۔'

اس کا اٹھا ہوا ہاتھ ہوا میں گر گیا۔'

(بارشِ سنگ، ص248 تا249)

مندرجہ بالا سطروں کی قرأت سے نہ صرف سلیم کا درد محسوس کیا جا سکتا ہے بلکہ اس کی اندرونی کیفیت کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ نورا بھابھی سے ان کے بیٹے کو رہن رکھنے کی بات کیوں کہہ رہا ہے۔ اس میں سلیم کا یہ جذبہ کام کر رہا ہے کہ بالواسطہ ہی سہی دوسروں کی طرح ملیشیم کے خون کو بھی غلامی کی لعنت جھیلنی پڑے۔

جیلانی بانو چونکہ حقیقت پسند فنکار ہیں اس لیے ان کے فکشن میں موجود کردار بھی معاشرے کی عام روزمرہ زندگی کے ہوتے ہیں جو زندگی کے نشیب و فراز سے گزرتے ہیں اور خوشی و غم، امید و ناامیدی کی کیفیت سے دوچار ہو کے بہتر مستقبل کے لیے جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں۔

جیلانی بانو جن موضوعات و مسائل کو ادب کے ذریعے پیش کرتی ہیں وہ کسی ایک فرد کے نہیں بلکہ پوری دنیا کے ہیں۔ خواہ وہ عورتوں کی تعلیم ہو یا آزادی یا مردوں کے ذریعے عورتوں پر کیے جانے والے ظلم و ستم ہوں یا سرمایہ داروں کے ذریعہ غریب مزدوروں، کسانوں پر کیے جا رہے ظلم و جبر ہوں، ان سب مسائل کو جیلانی بانو نے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں سے ادب میں سمیٹنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جیلانی بانو نے 'بارشِ سنگ' ناول میں حیدرآباد کے جاگیردارانہ نظام کی تصویر کھینچتے ہوئے اونچے طبقے کی زبان اور گاؤں میں بولی جانے والی زبان کو مختلف اور منفرد انداز سے مکالموں کے ذریعے کرداروں کی زبان سے ادا کرایا ہے۔ حیدرآباد کے مخصوص الفاظ جیسے لوگاں، ہاؤ، نکو، فارو، انگار لگو، اجاڑ صورت وغیرہ سے قارئین کو متعارف کرایا ہے۔ اس کے علاوہ شادی میں گائے جانے والے گیتوں کے استعمال سے زبان و بیان کے حسن میں اضافہ کیا ہے۔ اس طرح جیلانی بانو کے ناولوں کی یہ حیثیت بھی سامنے آتی ہے کہ ان کے ذریعے متعلقہ عہد کے تاریخی، سیاسی اور سماجی حقائق کو مرتب کیا جا سکتا ہے۔

□□□

Dr. Hina Afreen
Assistant Professor
Academy of Professional Development
of Urdu Medium Teachers,
Jamia Millia Islamia,
New Delhi. 110025

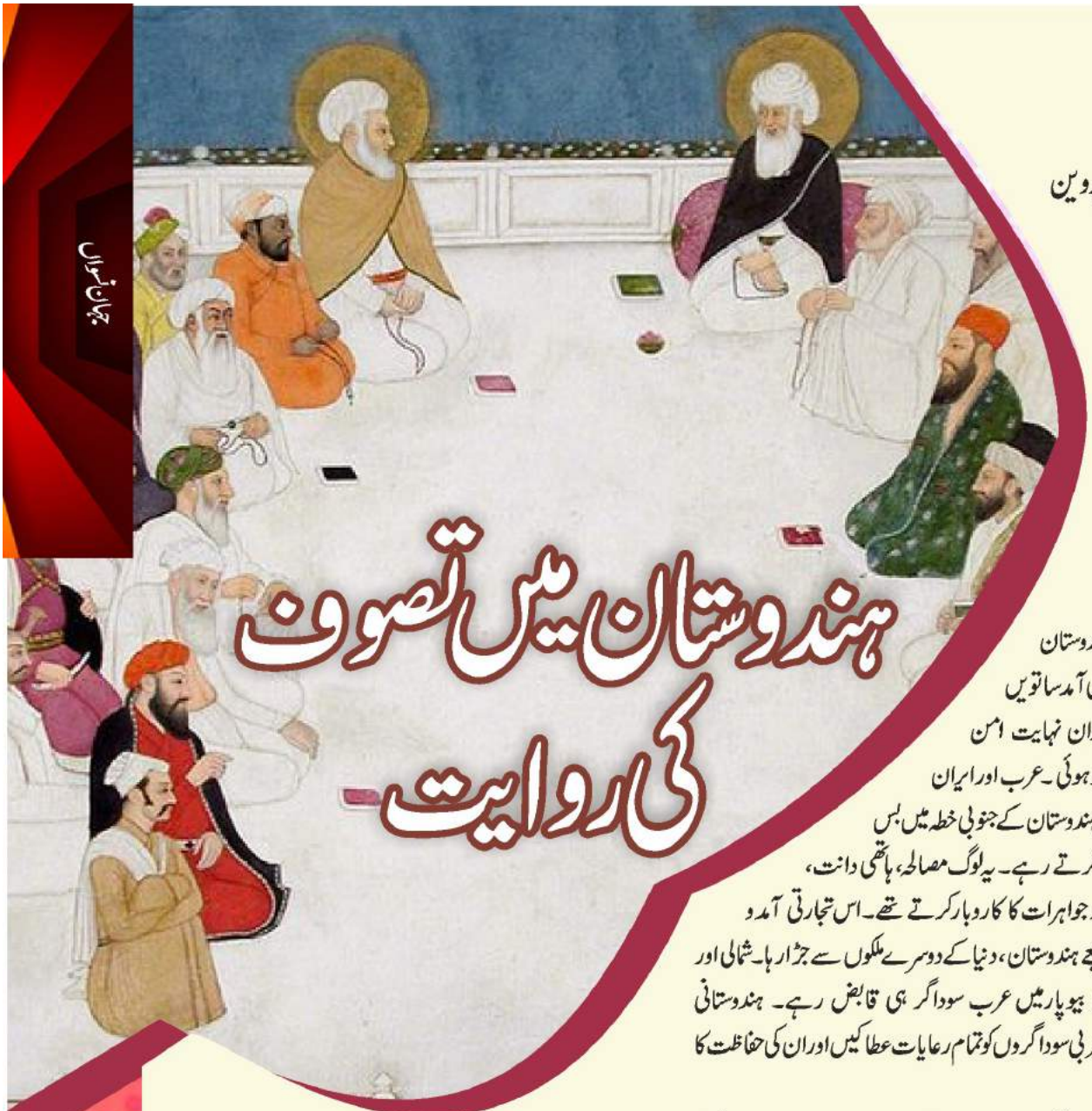

ہندوستان میں تصوف کی روایت

ڈاکٹر رئیسہ پروین

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد ساتویں صدی کے دوران نہایت امن وامان کے ساتھ ہوئی۔ عرب اور ایران کے سوداگر آکر ہندوستان کے جنوبی خطہ میں بس گئے اور کاروبار کرتے رہے۔ یہ لوگ مصالحہ، ہاتھی دانت، قیمتی پتھروں اور جواہرات کا کاروبار کرتے تھے۔ اس تجارتی آمدو رفت کے ذریعے ہندوستان، دنیا کے دوسرے ملکوں سے جڑا رہا۔ شمالی اور مغربی سمندری بیوپار میں عرب سوداگر ہی قابض رہے۔ ہندوستانی حکمرانوں نے عربی سوداگروں کو تمام رعایات عطا کیں اور ان کی حفاظت کا انتظام بھی کیا۔

عرب سوداگر اپنے کاروبار کے ساتھ اپنا مذہب اسلام بھی ہندوستان لے کر آئے ہندو حکمرانوں نے اسلامی مذہب کا پورا احترام کیا اور انھیں اپنی مسجدیں بنانے اور مذہب کی اشاعت کرنے کی کھلی آزادی بہم پہنچائی۔ کالی کٹ کے حکمراں، زمورن نے اسلام کو بڑھاوا دیا اور حکم دیا کہ اس کی سلطنت میں مچھواروں میں ایک یا ایک سے زیادہ آدمی کی پرورش مسلم طور طریقے سے کی جائے، اس کے پیچھے زمورن کا مقصد تھا کہ مسلم مذہب کو اپنانے والے یہ مچھوارے عربی جہاز چلائیں۔ کیونکہ ترقی کے معاملے میں وہ عربوں پر منحصر تھے۔ مچھوارے ہندوستان کے نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن مسلم بن جانے پر انھیں وہی احترام وعزت حاصل ہوتی تھی جس کے وہ حق دار تھے، ان حالات میں مذہب کی تبدیلی کو فروغ حاصل ہوا۔ ہندو حکمرانوں نے عربی سوداگروں کو ہندوستانی عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت بھی دے دی تھی۔ لہٰذا جلد ہی انڈو عربیہ قوم کا وجود عمل میں آیا۔

بیوپاری منافع اور ترقی کے علاوہ اسلام جیسے نئے اور سادگی پسند مذہب نے یہاں کے لوگوں پر تیزی سے اپنا اثر مرتب کرنا شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے مذہب اسلام میں لوگوں کی دلچسپی بڑھنے لگی۔ چنانچہ ہندوستان میں کاروباری غرض سے آنے والے تمام لوگ جنھوں نے متوسط دور میں ہندوستان کا رخ کیا تھا انھوں نے آخر کار یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ پڑھا لکھا طبقہ سیاحت کی غرض سے ہندوستان آنے لگا انھوں نے اپنی کتابوں میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ ہندوستانی حکمرانوں کے دلوں میں اسلامی مذہب کا بڑا احترام ہے۔ نویں صدی میں ہندوستان آنے والے عربی سوداگر سلیمان نے اپنی رائے کا اظہار کچھ اس طرح کیا

ہے کہ ہندوستانی راجہ اسلام کو فروغ دیتے ہیں۔ گجراتی راجہ ولبھی سے زیادہ عربوں کی عزت واحترام اور کوئی راجہ نہ کرسکا ایک نہایت معتبر بزرگ، بن شہریار نے لکھا ہے کہ ''کشمیر کے الور میں مہرہ کے راجہ نے نویں صدی میں قرآن شریف کا ہندی زبان میں ترجمہ کرایا اور روزانہ اسے کسی سے پڑھوا کر سنتے تھے۔ ایک مشہور مورخ مسعودی جنھوں نے سولہویں صدی کے اوائل میں مغربی ہندوستان کا سفر کیا تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ مغربی بندرگاہوں میں یا ساحلی سمندری علاقوں میں مسلمانوں کے لیے صورت حال نہایت حوصلہ کن ہے اور مغربی ہندوستان کے ولبھی حکمرانوں نے مسلمانوں کو کافی عزت واحترام سے نواز رکھا ہے۔ ان حکمرانوں نے اپنے عہد حکومت میں مسلمانوں کے حقوق اور ان کی حفاظت کا پورا خیال رکھا۔ راجہ چیرامن پیرومل جو مالابار کے آخری راجہ تھے انھوں نے اسلامی مذہب اختیار کیا اور عرب چلے گئے۔ چار سال بعد ہی ان کی موت ہوگئی۔ مالابار میں زمورن نے اس کی یادیں تازہ رکھیں اور اپنی تاج پوشی کے دوران انھوں نے مسلمانوں کی طرح کا لباس زیب تن کیا۔ نتیجتاً مالابار کی سبھی ریاستوں میں مسلمانوں کا ایک مضبوط کنبہ تیار ہوگیا، جن کے ساتھ ہندو حکمرانوں کا سلوک نہایت مخلصانہ تھا۔ اُن پر بھروسہ کیا جاتا تھا اور ان کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا گیا۔ دسویں صدی تک مسلمان تمام ساحلی علاقوں میں پھیل چکے تھے اور ہندوستان کی سیاست ومعاشرت میں پوری طرح اثر انداز ہونے لگے تھے۔

شمالی ہندوستان میں پہلی بار عرب مسلمان مغرب سے داخل ہوئے۔ وہ یہاں حملہ آور کے روپ میں آئے۔ اگرچہ انھوں نے سندھ کو فتح کیا لیکن وہ اس سے آگے نہ بڑھ سکے۔ البتہ محمد غوری کے حملے سے پہلے ہندوستان مسلمان اور ان کے مذہب سے واقف ہو چکا تھا۔

1206 کے بعد مسلم حکمراں اقتدار میں آگئے، لیکن ان حملہ آوروں کے ساتھ کچھ ایسے امن پسند لوگ بھی آئے جنھوں نے پیار محبت اور امن کا پیغام دیا اور ہندو مسلمانوں کے بیچ اتحاد پیدا کیا۔ اس طرح ہندو مسلمانوں کو ذہنی وعملی طور پر ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کی یہ صوفی منش لوگ عام طور پر عبادت میں ہی مشغول رہتے تھے۔ اور صوفی تعلیمات کو عام کرنے کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کرتے رہتے تھے وہ لوگوں سے مل کر اپنے خیالات وتصورات کی اشاعت کیا کرتے تھے۔ یہاں کی عوام نے ان کے خیالات وتصورات سے اثر قبول کیا اس طرح ان صوفیوں اور ہندوستانیوں میں ہم آہنگی پیدا ہوگئی۔ انھوں نے کٹر اسلام کی جگہ ایسے اسلام کی اشاعت کرنی شروع کردی جو ہندوستانی سرزمین کی مہک لیے ہوئے تھا۔ انھوں نے ہندو ویدوں کا مطالعہ کیا اور یہاں کی زبان اور بولیاں سیکھیں۔ یہاں کے صوفی سنتوں سے ملے اور اپنے مذہب کو یہاں کی روایات، عقائد اور رسم ورواج میں شیر وشکر کردیا۔ یہ لوگ صوفی تھے اور ان کے ذریعے پھیلنے والا مذہب صوفی ازم کہلایا۔ اس دور کے ہندوستان پر صوفی ازم نے بہت گہرے اثرات مرتب کیے۔ ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں کہ:

> ''صوفی ازم ایسے گہرے خیالات کو ظاہر کرتا تھا جس میں عشق، شاعری، گیت، ناچ اور عبادت میں خدا سے بے حد قربت کا جذبہ نظر آتا تھا۔'' صوفی لوگ صرف مذہبی معاملات میں ہی دخیل نہیں تھے بلکہ آپسی بیر اور نفرت کو دور کرنے کے ساتھ ساتھ سماج میں بھائی چارہ اور میل وملاپ کے دائی بھی تھے اور ان پہلوؤں کو بڑھانے کے لیے کام کرتے تھے۔ انھوں نے سماج میں پھیلی دغابازی اور فریب کی کڑی مخالفت کی اس کے ساتھ فرسودہ عقائد ورسوم ورواج جیسے عناصر کو سماج سے اکھاڑ پھینکنے کی طرف زور دیا۔ اور سبھی انسانوں میں برابری اور مساوات کے جذبات کو ابھارنے کی کوششیں کیں۔ کیونکہ صوفی ازم کا بنیادی مقصد ضرورت مندوں کی مدد کرنا اور دبے کچلے لوگوں کو سماج میں اونچا مقام دلانا تھا۔ اس لیے انھوں نے عام لوگوں کے بیچ اپنی تعلیمات کو عام کیا اور اس بات کی تعلیم دی کہ انسان خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو اسے انسانوں سے ہمدردی کرنی چاہیے اور صبر وتحمل سے کام لے کر اپنے دکھوں کا مداوا کرنا چاہیے کسی کی غلطی پر اسے معاف کرنے جیسے مثبت اصولوں کو اپنانا چاہیے۔

صوفیوں کے ان فلسفیانہ اور انسانی ہمدردی کے خیالات کو دیکھ کر بہت سے لوگ ان کے مرید ہوگئے۔ جنھوں نے صوفی ازم اختیار کیا، انھیں صوفیوں نے روحانیت کے پیش نظر خدا کے بارے میں ایک مثبت سوچ عطا کی، صوفیوں کی خانقاہوں میں مرید تمام رات عبادت میں گزارتے تھے، ان خانقاہوں کے دروازے ہر مذہب، ہر طبقہ اور ہر عقیدے کے لوگوں کے لیے کھلے تھے۔ یہاں کوئی اعلیٰ وادنیٰ نہیں سب کو برابر کا درجہ حاصل تھا، وقت کے ساتھ ساتھ صوفیوں کے رتبے میں وسعت پیدا ہوگئی۔ صوفیائے کرام عزت واحترام کی زندگی گزارتے تھے ان کے انتقال کے بعد ان کے مریدان کی یاد میں درگاہیں اور مزار بناتے تھے جو ان کے ماننے والوں کے لیے ایک معتبر مقام کی حیثیت رکھتا تھا۔

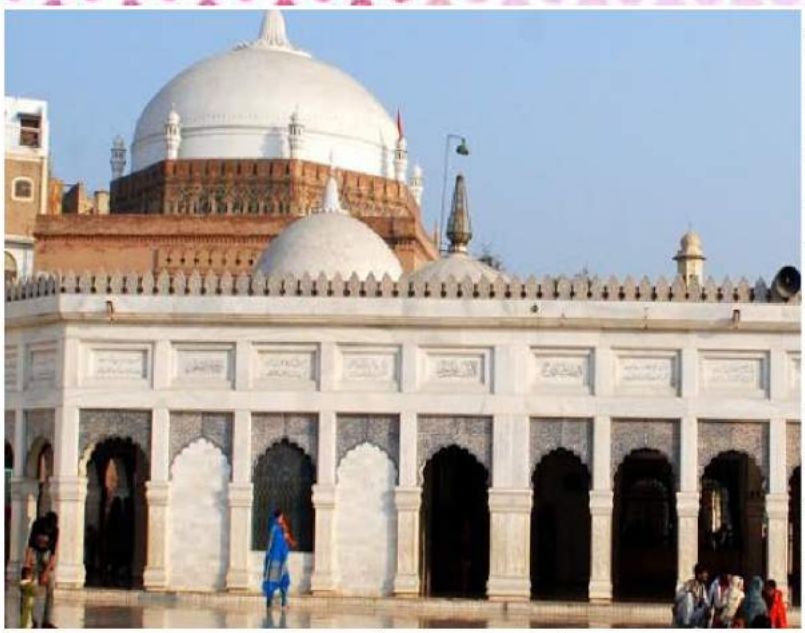

پنجاب کی سرزمین صوفیوں کے لیے کافی سازگار ثابت ہوئی۔ یہاں پر بسنے والے صوفیوں میں کئی نام قابل ذکر ہیں ان میں سب سے پہلا نام علی مخدوم ہجوری 1092 کا ہے جو اپنی فراخ دلی اور بے تعصبی کی وجہ سے داتا گنج بخش کے نام سے مشہور ہوئے۔ سبھی عقیدے و مذہب کے لوگ اور اس عہد کے راجہ بھی داتا گنج بخش کی درگاہ میں خراجِ عقیدت پیش کرنے آیا کرتے تھے ایک اور بزرگ سید احمد سلطان سکھی سرور بھی لکھی داتا کے نام سے مشہور ہوئے۔ وہ بھی ہندو اور مسلمانوں میں بہت مشہور ہوئے پنجاب میں سب سے زیادہ اہم نام شیخ بابا فرید الدین مسعودِ گنج شکر 1265 کا تھا جو بابا فرید کے نام سے مشہور ہیں، وہ افغانستان کے ایک شاہی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ بعد میں ان کا خاندان ملتان میں آ کر بس گیا۔ صوفی فلسفہ نے انھیں گہرائی سے متاثر کیا تھا۔ جس کے زیر اثر وہ اپنی تمام دھن و دولت اور جائداد چھوڑ کر خواجہ قطب الدین چشتی کے مرید ہو گئے اور آجودھن میں آ کر بس گئے جواب پاکستان میں پاک پٹن کے نام سے جانا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے مذہبی خیالات کا اظہار پنجابی دوہوں کے ذریعے کیا ہے کہتے ہیں۔

فرید شکر کھانڈ نیبت گڑ مکھیو ما نجھا دودھ
سبھی وستو مٹھیاں ناپو جنی تدھ

ترجمہ: ''شکر، شہد، کھانڈ، گڑ کا شیرا اور دودھ سبھی میٹھے ہوتے ہیں، لیکن کسی کی بھی مٹھاس کی مثال اللہ کے نام کی مٹھاس سے نہیں کی جاسکتی''۔

انھوں نے اپنے مریدوں کو بتایا کہ اللہ کو تلاش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ ہر جگہ ہے اور آپ کے اندر بھی موجود ہے۔ ان کی تعلیم کا لوگوں پر بہت گہرا اثر ہوا اور ان کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ بابا فرید نے 134 مناجات لکھیں جو مشہور ہیں مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کے دلوں میں بھی ان کے لیے احترام و عزت تھا ہزاروں کی تعداد میں لوگ بابا فرید کی چوکھٹ پر اپنا خراج عقیدت پیش کرنے آیا کرتے تھے اور ان سے دعائیں حاصل کرتے تھے۔ لوگ ان کے کتنے دلدادہ تھے اس کا اندازہ تب ہوا جب وہ دہلی میں بزرگ قطب الدین بختیار کاکیؒ سے ملنے آئے، تو وہاں بابا فرید کے مریدوں کا ایک جم غفیر اُمنڈ پڑا اسی طرح کا منظر اس وقت بھی دیکھنے کو ملا جب سلطان نصیر الدین نے 1252-1253 میں اُچ کی طرف کوچ کیا تو ان کی فوج کے سپاہی بابا فرید کے استقبال کے لیے آجودھن میں اتنی تعداد میں پہنچ گئے کہ بھگدڑ مچنے کا اندیشہ ہو گیا، ایسے نازک وقت میں بابا فرید کے مریدوں نے ان کی حفاظت کی اور انھیں گھیرے میں لے لیا۔

بابا فرید کا اپنے مریدوں کے ساتھ گہرا رشتہ تھا۔ انھوں نے اپنی تمام زندگی غریبی، مفلسی اور فاقہ کشی میں گزار دی لیکن کبھی زبان پر شکوہ نہیں آیا خوش رہنے والے اس مست مولا کو امیروں کی صحبت سخت ناپسند تھی۔ انھوں نے اپنے مریدوں کو تاکید کی تھی کہ:

''میری نصیحت ہمیشہ یاد رکھنا روحانیت کی بقا کے لیے حکمرانوں اور امیروں سے کبھی قریبی دوستی مت کرنا اپنے گھر میں ان کے آنے کو مصیبت سمجھنا۔''

حضرت نظام الدین اولیاؒ کو صلاح دیتے ہوئے بابا فرید نے ان سے کہا تھا۔

''صوفی کے راستے کا خاص مقصد اپنے دل پر قابو رکھنا ہے جو روزی روٹی حاصل کرنے کے ناجائز طریقوں سے بچنے اور حکمرانوں کی صحبت سے دور رہنے پر ہی حاصل ہو سکتا ہے۔''

بلبنؔ اور علاؤالدینؔ جیسے سلطانوں کے دلوں میں بابا فریدؔ کے لیے نہایت عزت و احترام تھا ایک بار علاؤالدین، بابا فرید سے حکومت کے امور میں مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ بابا فرید نے جواب دیا:

''او! سلطان میں دیش کے سنبھالنے میں تجھے کوئی صلاح دینے سے انکار کرتا ہوں، ہم صوفی لوگوں کا کام روحانی

وابدی دنیا کو سنبھالنا ہے۔ اس لیے ہم تمھارے دنیاوی معاملات میں دخل اندازی نہیں کریں گے۔''

بابا فرید کے گیارہویں جانشین شیخ ابراہیم اور لاہور کے ایک صوفی بزرگ میاں میر (1550-1636) تھے۔ سارے ملک میں بڑی تعداد میں ان کے ماننے والے موجود تھے۔ وہ شریعت کے بجائے عبادت مراقبے، توبہ اور نفسِ امارہ کو مارنے پر زور دیتے تھے۔ بادشاہ جہانگیر نے اپنی سوانح عمری تزکِ جہانگیری میں میاں میر کے بارے میں لکھا ہے:

''حقیقت میں یہ خدا سے سچا پیار کرنے والے ہیں، روح کی پاکیزگی اور طہارت میں کوئی بھی ہمعصران کی برابری نہیں کرسکتا۔''

جہانگیر بادشاہ میاں میر کی صحبت میں جاتے اور ان سے مذہبی درس حاصل کرتے تھے لاہور میں میاں میر سے ملنے دور دور سے لوگ آتے اور ان سے دعائیں برکتیں اور مشورے لے کر لوٹتے۔ ان کی بے تعصبی اور رحم دلی کو دیکھ کر بنا کسی بھید بھاؤ کے ہندو اور مسلمان یکساں طور پر ان سے فیض یاب ہوتے تھے۔ امرت سر کے گولڈن مندر کا سنگ بنیاد میاں میر نے ہی رکھا تھا۔ وہ ایک خدا پر یقین رکھتے تھے اور اپنے مریدوں کو فرقہ پرستی سے بچا کر اس قادر مطلق کی عبادت کرنے کی تعلیم دیتے تھے۔

ملا شاہ بدخشانی (1661) ان کے مریدوں کی بھی بڑی تعداد تھی۔ انھوں نے ہندومت کا مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ تمام مذہب ایک جیسے ہیں، کیونکہ وہ ایک ہی خدا کی عبادت کرنے کی بات کرتے ہیں۔ ان کے مریدوں میں شہزادہ داراشکوہ اور ان کی بہن جہاں آرا بھی شامل تھیں پنجاب کے ایک اور نہایت اہم صوفی بزرگ بلے شاہ جو 1680 کو کسور میں پیدا ہوئے انھوں نے اپنے ابتدائی ایام صوفی سنتوں اور ویدانتوں کی صحبت میں گزارے جب وہ بڑے ہوئے تو ایک مشہور صوفی شاہ عنایت کی تلمیذ میں شامل ہوگئے شاہ عنایت اپنی بے تعصّبانہ نظریہ کے لیے مشہور تھے انھیں کے زیرِ اثر بلّے شاہ بھی پیار و محبت اور پرہیز گاری پر پختہ یقین رکھتے تھے کیونکہ اسی راستے کو اپنا کر خدا کو پہچانا جاسکتا ہے اور یہی نجات کا راستہ ہے اسی سے انسان کی تکمیل ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

بُلّے کی جانڑا میں کون؟
نہ میں مومن وچ مسیح
نہ میں وچ کفر دیاں ریتاں
نہ میں پاکاں وچ پالیتا
نہ میں موسیٰ نہ فرعون
بُلّیہ کی جانڑا میں کون

ان کی راہ خدا کو پانے کی سچی راہ تھی۔ انھوں نے بھگوان کرشن کا بھی اتنا ہی احترام کیا جس طرح کہ حضرت محمدؐ کی عزت و احترام سے ان کا سینہ لبریز تھا۔ بلے شاہ نے پنجابی زبان میں خدا کی شان میں دوہے اور نظمیں لکھیں وہ اپنے نظریات و تصورات کا اظہار کرنے کے لیے قریہ قریہ گھوما کرتے تھے۔ ان کے خیالات غیر فرسودہ اور غیر تعصبی سے عبارت تھے۔ ملا اور پنڈت دونوں کو بلے شاہ نے طنز کا نشانہ بنایا ان کی مذہبی وسیع المشربی نے پنجاب کے لوگوں کے دلوں میں جگہ بنالی ہندو مسلم دونوں ہی ان کے لکھے ہوئے صوفیانہ کلام کو نہایت احترام سے گاتے تھے آج بھی ان کے گیت ہندوستان اور پاکستان میں پسند کیے جاتے ہیں۔ راج کپور کی مشہور زمانہ فلم ''بابی'' میں بلے شاہ کا گیت''۔ آج بھی لاکھوں دلوں کی دھڑکن ہے۔

''بے شک مندر مسجد ڈھا دو بُلّے شاہ یہ کہتا
پر پیار بھرا دل کبھی نہ توڑو، اس میں دلبر رہتا
جس پڑلے میں تلے محبت اس میں چاند نہیں تولنا

صوفیائے کرام میں نہایت معتبر اور بلند صوفی شخصیت خواجہ معین الدین چشتیؒ (1236) اجمیری ہیں، ان کے مریدوں کی ایک

کثیر تعداد ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب معین الدین چشتیؒ مستقل طور پر اجمیر میں سکونت پذیر ہوگئے۔ تو اونچی ذات کے پنڈتوں نے اجمیر کے حکمراں پرتھوی راج سے ان کو وہاں سے ہٹانے کی بات کہی۔ راجہ نے مندر کے خاص پنڈت شادی دیو (شادی رام) کے ذریعے خواجہ کو شہر چھوڑ دینے کے لیے کہلا بھیجا۔ کہا جاتا ہے کہ خواجہ کو شہر چھوڑنے کے لیے کہنے والا پنڈت شادی دیو خواجہ معین الدین چشتیؒ کی روحانیت سے بے انتہا متاثر ہوا اور اسلام مذہب قبول کر کے خواجہ کا مرید بن گیا۔

خواجہ معین الدین چشتیؒ نے ہمیشہ امن، اتحاد، اور انسانی وجود کی اہمیت اور عظمت کو قائم کرنے پر زور دیا، یہی وجہ ہے کہ مذہبی، بھید بھاؤ سے اوپر اٹھ کر تمام لوگوں کا احترام اور پیار انھیں یکساں طور پر حاصل ہوا۔ انھوں نے انسانوں کی فلاح و بہبودگی کے کاموں کو اہمیت دی۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ خدا کی راہ میں ایثار و قربانی کی کیا صورت ہے تو انھوں نے جواب دیا ۔''انسانوں کے دکھ درد کا مداوا کرنے کے لیے بے سہارا لوگوں کی مدد کرنا، ان کی ضرورت کو پورا کرنا اور بھوکے کو کھانا کھلانا اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔''

انھوں نے اپنے مریدوں سے کہا ''ندی جیسی فیاضی، سورج جیسی انجام دہی اور زمین جیسی مسافر نوازی اختیار کرو'' ان کی نظر میں تمام انسان برابر ہیں، وہ تمام مذاہب میں اتحاد، مذہبی آزادی اور غیر تعصّبانہ رویہ کو ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ عام انسانوں اور حکمرانوں نے مشکل اور تناؤ کے دور میں ان کی تعلیمات اور دعاؤں سے استفادہ کیا۔ خواجہ کی وفات کے بعد ان کی درگاہ تمام مذاہب کے لوگوں کے لیے یکساں طور پر عقیدت واحترام کی جگہ بن گئی ہے۔

دہلی میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ 1236 بابا فرید کے روحانی استاد تھے۔ دہلی میں ان کی ہردلعزیزی اپنے عروج پر تھی۔ ان کی دینی تعلیم میں محمدؐ کی پاکیزہ تعلیم کے ساتھ سنسکرت کے فلسفیانہ اور مابعد الطبعیاتی مسائل سے متعلق اور ویدوں کے عہد کے ادب کی آمیزش کا انوکھا سنگم ہے۔ بختیار کاکیؒ، خود افلاس اور فاقہ کی زندگی گزارتے رہے لیکن انھوں نے کبھی کسی حاکم الوقت سے کوئی تحفہ یا رتبہ قبول نہیں کیا۔ بادشاہ التمش قطب الدین صاحب کی بہت عزت واحترام کرتے تھے۔ قطب الدین صاحب نے التمش کو حکم دیا:

> ''او! دہلی کے بادشاہ! آپ کے لیے یہ لازم ہے کہ آپ سبھی غریبوں، فقیروں، بزرگوں اور بے سہارا لوگوں کی بھلائی کریں، سبھی لوگوں پر رحم کریں اچھا سلوک کریں اور ان کی فلاح و بہبودی کے کام میں لگ جائیں جو بھی دین دکھیوں سے ایسا برتاؤ کرتا ہے اللہ اسے برکتوں سے نوازتا ہے ،اور اس کے سارے دشمن دوستوں میں بدل جاتے ہیں۔''

التمش چاہتے تھے کہ قطب صاحب، شاہی بزرگ بن جائیں لیکن قطب صاحب نے ان کے اس مشورے کو ٹھکرا دیا۔ ان کی ہردلعزیزی کا یہ حال تھا کہ ایک بار قطب صاحب نے دہلی چھوڑ کر اجمیر جانے کا فیصلہ کیا لیکن دہلی کے باشندوں کا ایک ہجوم امڈ آیا اس میں التمش بادشاہ بھی شامل ہوئے اور قطب صاحب کے حضور گزارش کی کہ وہ انھیں چھوڑ کر نہ جائیں۔ قطب صاحب کی وفات 1235 میں ہوئی اور انھیں مہرولی کے پاس سپرد خاک کیا گیا۔ سلطان التمش نے ان کی یاد میں مینار بنوائی۔

دلّی کے سب سے زیادہ ہردلعزیز صوفی بزرگ حضرت نظام الدین اولیاءؒ جن کی پیدائش 1325 عیسوی میں ہوئی۔ ان کی وسیع المشربی اور انسانی دوستی جیسے نظریات نے ہندوستان کے ہندو مسلم دونوں کو یکساں طور پر متاثر کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ انسانی فلاح و بہبودگی کے کام کرنے سے ہی انسان کی روح کو نجات حاصل ہوسکتی ہے۔ اس کے ساتھ وہ دنیا میں بھی امن وخوشی کا باعث بن جاتا ہے۔ نظام الدین اولیاءؒ کا سلسلہ نسب بابا فرید گنج شکر سے ملتا ہے۔ بابا فرید کی طرح نظام الدین اولیاءؒ کے بھی عالموں اور دیگر ہندو سنتوں سے تعلقات تھے وہ سب حضرت نظام الدین صاحب کا نہایت احترام کرتے تھے۔ نظام الدین اولیاءؒ نے دہلی کے تخت پر یک بعد دیگرے کئی بادشاہوں کو گدی نشین ہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ لیکن کبھی کسی دربار سے وابستہ نہیں ہوئے۔ خواجہ کی خانقاہ کے دروازے سبھی کے لیے کھلے تھے ان کے عقائد دینی کا اثر تیزی سے پھیل رہا تھا۔ ضیاء الدین برنی

جوایک راسخ العقیدہ مورخ تھے۔انھوں نے عالی نسب بزرگان دین کے بارے میں لکھا ہے کہتے ہیں:

''خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے اپنے دل کے دروازے سبھی کے لیے کھول دیے اور ہر طرح کے لوگوں، اعلیٰ خاندان، عام انسانوں ، امیر غریب پڑھے لکھے اور جاہل ، غلام سبھی کو اپنایا لوگ بہت سی برائیوں سے اس لیے دور رہتے تھے کیونکہ وہ خود کو خواجہ کا مرید مانتے تھے لوگوں کا مذہب اور عبادت کی طرف جھکاؤ تھا۔شہر میں کوئی ایسا گھر نہیں تھا جہاں ہر مہینے خدا ترس بزرگوں کا اجتماع نہ ہوتا ہو۔''

نظام الدین اولیا کے اجتماع میں بڑی تعداد میں لوگ پہنچتے تھے ان کی خانقاہ علم حاصل کرنے کا گہوارہ بن گئی تھی اور جو نقد یا چیزوں کی شکل میں چڑھاوا آتا تھا اسے وہ لنگر (مفت کھانا کھلانا) کے خرچے میں دے دیتے تھے نظام الدین اولیاءؒ کی سخت تاکید تھی کہ جو کچھ بھی نذرانہ حاصل ہو، اسے شام تک خرچ ہو جانا چاہیے۔ان کے لنگر میں ہر روز ہزاروں غریب غرباء اور ضرورت مند لوگ کھانا کھاتے تھے۔خواجہ نظام الدین اکثر روزہ رکھتے اور شام کو صرف آدھی روٹی کے ساتھ کچھ ابلی ہوئی سبزیاں کھاتے تھے۔ انھوں نے سبھی کو اس بات کی تائید کی کہ دوسرے مذاہب کے بارے میں بھی دلوں میں عزت واحترام ، رواداری اور ہمدردی کا جذبہ ضروری امر ہے۔خواجہ نظام الدین نے ایک بہت اچھی بات کہی کہ حشر کے دن آپ کے لیے اس سے بہتر اور کوئی تحفہ نہیں ہوسکتا کہ آپ نے دنیا میں انسانوں کے دلوں میں خوشیاں بھر دیں۔ان کی دن بہ دن بڑھتی شہرت کے پیش نظر متعصب علماؤں کو سانپ سونگھ گیا۔حضرت امیر خسرو خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مریدوں میں خاص مقام رکھتے تھے وہ نظام الدین اولیاءؒ سے نہایت عقیدت واحترام کا جذبہ رکھتے تھے۔امیر خسرو نے خواجہ کی تعریف میں شعروشاعری کی۔انھوں نے ایکتا اور بھائی چارہ کا پیغام دیا اور ہمیشہ کے لیے لوگوں کے دلوں میں اپنا ایک خاص مقام بنالیا۔امیر خسرو اپنے دوہے میں کہتے ہیں:

آے کزی بتانہ یا ہندوبار
ہم آزوالے آموز پرستش گر

ترجمہ: اے تم ہندوؤں کی مورتی پوجا کو حقارت سے دیکھتے ہو۔ سیکھو کہ پوجا یا عبادت کیسے کی جاتی ہے۔''

نظام الدین اولیاء کے خیالات نے آنے والے دور کے تمام صوفیوں کو بہت متاثر کیا۔ دہلی کے ایک اور بہت ہی مشہور صوفی شہید سرمد صاحب تھے انھوں نے سترہویں صدی میں دہلی والوں کے دلوں پر راج کیا۔وہ اکثر کہا کرتے تھے:

''میں قرآن کا حکم مانتا ہوں'' سرمد صاحب کا کہنا تھا کہ اللہ ایک ہے وہ ہر جگہ ہے اور سچی عبادت سے اس کی خوشنودی حاصل کی جاسکتی ہے۔

اس مختصر سے جائزہ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ تمام مسلم صوفیائے کرام کی تعلیمات کے پیچھے جو عناصر کارفرما تھے ان میں اولیت، انسانی فلاح و بہبود کے جذبے کو حاصل تھی۔ان کا مقصد تمام انسانوں کے بیچ اخوت اخلاقی برتری، انسانیت، ایک دوسرے سے ہمدردی اور پیار کے جذبات کو تشکیل دینا تھا۔آج کے دور میں اس طرح کی شخصیات کی ازحد ضرورت ہے جہاں معاشرہ نفرت اور تنگ نظری اور تعصّبات کا شکار ہے وہاں اس طرح کی شخصیات کا ظہور رحمت نہیں تو اور کیا ہے۔

حوالہ جات:

1.Heritage Harmony: an insight into Medieval India, Ajeet Jawed, New Delhi, 2002, Page:11

2. " " " Page. 12

3. " " " Page. 15

4. " " " Page. 16

❑❑❑

Dr. Raisa Parveen

934, Kucha Rohilla Khan

Tiraha Bahram Khan

Darya Ganj

New Delhi-110002

ڈاکٹر شاہینہ تبسم

ہندوستان کی مشترکہ تہذیب

(خواتین ناول نگاروں کے حوالے سے)

تاریخ ہند سے سرسری واقفیت رکھنے والے بیشتر لوگ ہندو مسلم تعلقات کا نقطہ آغاز 712 ہجری میں سندھ پر حملۂ محمد بن قاسم کو مانتے ہیں جبکہ اس سے بہت پہلے سندھ سے لے کر کاٹھیاواڑ گجرات، ممبئی، تامل ناڈو اور کیرل تک ساحلی علاقوں کے باشندوں کے ایران و عرب کے لوگوں سے تعلقات کے ثبوت کتب ہائے قدیم میں موجود ہیں۔ سرائیکی، سندھی، گجراتی، تمل، تیلگو اور ملیالم زبانوں میں عربی اور فارسی کے دخیل الفاظ اس حقیقت کے جیتے جاگتے ثبوت ہیں، جن میں ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی جڑوں کی تلاش کی جاسکتی ہے کہ درحقیقت اسی دور میں ہندو اور مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت اور رسم و رواج ایک دوسرے پر اثر انداز ہوئے ہوں گے جن کے واضح اثرات دہلی سلطنت کے عہد میں مقبول خاص و عام شاعر و موسیقار امیر خسرو کے فن اور ان کی شخصیت میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں بعد کے زمانوں میں ہندی اور اردو زبانوں میں بھکتی اور تصوف کی تحریک اسی گلشن کے گلہائے رنگارنگ ہیں جن کی خوشبو سے دیارِ ہند کی فضائیں اب تک معمور ہیں۔

آمدم برسر مطلب ہندوستان کی اس مشترکہ تہذیب کی ترویج و ترقی میں خواتین کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔ بہت بڑا اس لیے کہ تہذیب و تمدن کی آبیاری کا کام ہر ملک و قوم میں عام طور پر جس طرح خصوصی توجہ اور حسن و خوبی کے ساتھ خواتین انجام دیتی ہیں اسی طرز و انداز اور فکر و احساس کے ساتھ مرد ناول نگار نہیں دے پاتے۔ خیر یہ ایک الگ موضوع بحث ہے جس پر اظہار خیال پھر کسی وقت کے لیے چھوڑتی ہوں۔ یوں تو اردو کا پورا ادب بلکہ سچ پوچھو تو اردو زبان ہی ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی علمبردار ہے لیکن میرا یہ مختصر سا مضمون تانیثی ادب بالخصوص خواتین کی ناول نگاری یا ناول نویسی تک محدود ہے جو ہماری مشترکہ تہذیب کا ایک روشن باب ہے۔

اردو میں ناول نویسی کا آغاز و ارتقا انیسویں صدی کے نصف آخر سے عبارت ہے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اردو ناول نے اپنی تشکیل سے تکمیل کا سفر بہت ہی کم مدت یعنی صرف بیس پچیس برس میں طے کرلیا۔ اردو ناول کی تاریخ میں اس کی تفصیلات مذکور ہیں جن کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ اس عرصے میں تخلیق کیے جانے والے ہر ناول میں مشترکہ تہذیب کے عناصر موجود ہیں۔ کسی میں کم اور کسی میں زیادہ، ان ناولوں کے مصنفین پریم چند بھی ہیں اور راشد الخیری بھی، رتن ناتھ سرشار بھی، اور سرفراز حسین عزمی بھی، کرشن پرساد کول بھی ہیں اور آغا شاعر قزلباشی بھی۔ منشی سجاد حسین بھی ہیں

اور مرزا رسوا بھی، ان سب کے ناولوں میں مشترکہ تہذیب کے تار و پود کہیں دھندلے اور کہیں واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ سچ کہا جائے تو ہماری تہذیب کا تانا بانا کچھ اس قسم کا ہے کہ اس میں رہنے بسنے والوں کی زندگی کو اس وصف سے علاحدہ نہیں کیا جاسکتا، اور ناولوں کے کرداروں کو پیش کرتے ہوئے بسا اوقات شعوری طور پر اور بعض اوقات لاشعوری طور پر مشترکہ تہذیب کے ہلکے گہرے رنگ اور نقوش ان سے جھلکتے نظر آتے ہیں۔

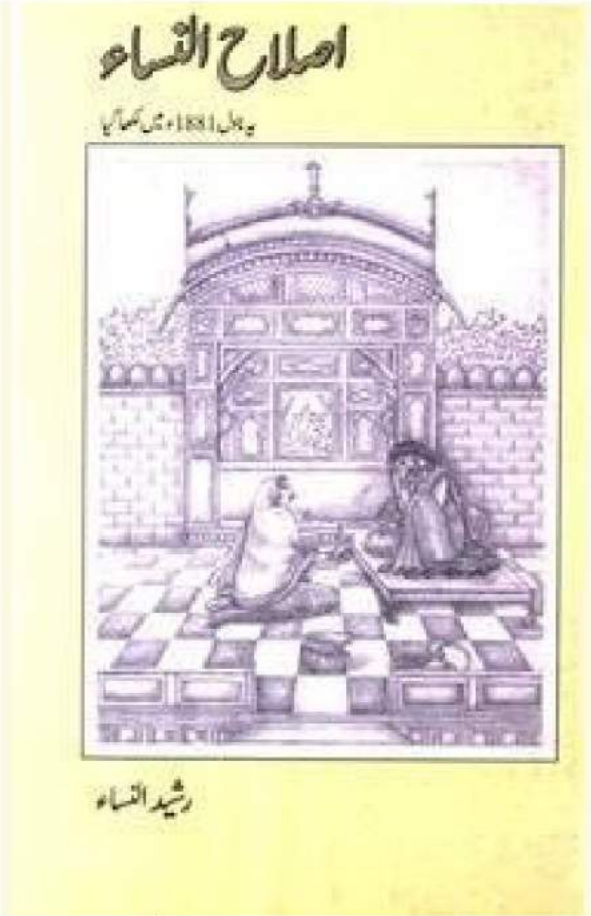

خواتین ناول نگاروں کی بات کی جائے تو اس ضمن میں ہوئی ادبی تحقیق کے نتیجے میں کئی خاتون ناول نگاروں کے رشحات قلم سامنے آئے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ دور ہندوستانی سماج کا وہ دور ہے جب خواتین کے لیے مردوں سے پردہ کرنے کا رواج عام تھا۔ خواہ وہ ہندو گھرانوں کی خواتین ہوں، خواہ مسلم گھرانوں کی ہوں، پردے کا رواج دونوں جگہ تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پردے کا رواج خواتین کے جسمانی وجود تک ہی محدود نہ تھا، بلکہ ان کے ناموں تک کو پردے میں رکھنے کا رواج تھا۔ ہندی فکشن میں جہاں ایک عورت کو اپنی تخلیق شائع کراتے وقت اپنا نام مخفی رکھ کر ایک بنگ مہیلا یعنی ایک بنگالی عورت لکھنا پڑتا تھا وہیں دوسری طرف مسلمان عورت کو اپنا حقیقی نام چھپا کر والدہ افضال علی لکھنا پڑتا تھا۔ گو کہ یہ سلسلہ بہت زیادہ عرصے تک جاری نہیں رہ سکا اور چند جرأت مند فکشن نگار خواتین نے اس رواج کو توڑ کر اپنے حقیقی ناموں سے لکھنے کی روایت قائم کرنے میں تاخیر نہیں کی۔

اس سلسلے کا پہلا ناول ''اصلاح النساء'' ہے، جس کا سن تصنیف 881 ہجری ہے اور رشیدۃ النساء اس کی مصنفہ ہیں۔ آج اس ناول کو اردو زبان میں تانیثی ادب کے نقش اول کا درجہ حاصل ہے۔ ناول کے دیباچہ میں مصنفہ نے مولوی نذیر احمد کے حوالے سے بڑی جرأت و اعتماد کے ساتھ لکھ دیا کہ جہاں تک ان کو معلوم تھا انھوں نے لکھا اور اب جو ہم جانتے ہیں اس کو لکھیں گے اور یہ بھی کہ میرے لکھنے میں عمدہ بات یہ ہوگی کہ اس کتاب کے پڑھنے سے عورتوں پر اثر زیادہ ہوگا اور وہ سمجھیں گی کہ اس نے عورتوں کی رسموں کو جہاں تک لکھا ہے آنکھوں دیکھی بات ہے۔

'اصلاح النساء' بلاشبہ ایک بلند پایہ ناول نہیں لیکن سماجی رسم و رواج کی عکاسی کے لحاظ سے یقیناً یہ ناول قابل قدر ہے اور یہی وہ رسم و رواج ہیں جو مشترکہ ہندوستانی تہذیب کے بیش قیمت سرمائے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ رشیدۃ النساء نے اپنے اس ناول کے ذریعے ان کی عکاسی کی جو روایت قائم کی وہ آنکھوں دیکھی حقیقتوں پر استوار ہونے کی وجہ سے ایک جاندار روایت ثابت ہوئی۔ رشیدۃ النساء کے عہد میں نمایاں ہونے والی کئی خاتون ناول نگاروں مثلاً والدۂ افضال علی یعنی اکبری بیگم (مصنفہ گدڑی کا لعل) محمدی بیگم (مصنفہ صفیہ بیگم، شریف بیٹی اور آجکل وغیرہ)، مسز عباس طیب جی (مصنفہ شوکت آزاد) صغریٰ ہمایوں مرزا (مصنفہ سرگزشت ہاجرہ) عباسی بیگم (مصنفہ زہرا بیگم) کے علاوہ حسن بیگم، ظفر جہاں، طیبہ بیگم، مسز عبدالقادر، بیگم شاہنواز اور ضیاء بانو وغیرہ خاتون ناول نگاروں کی ایک پوری کہکشاں سی نظر آتی ہے جو بیسویں صدی کے اوائل سے تقریباً چار دہائیوں تک جگمگاتی ہے، ان خواتین کے ناولوں کے کردار، پلاٹ اور موضوعات باہم دگر مختلف ہونے کے باوجود مشترکہ تہذیب کی عکاسی کے معاملے میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں گھریلو زندگی کی جو تصویر کشی ملتی ہے وہ درحقیقت ہماری سماجی زندگی، طرز معاشرت اور رسم و رواج کی ایسی حقیقی تصویر کشی ہے جو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کی جان و ایمان اور ترجمان بھی ہے۔

اسی اثنا میں نذر سجاد یعنی والدہ قرۃ العین حیدر کے چھ ناول یکے بعد دیگرے منظر عام پر آئے جن میں حرماں نصیب، آہ مظلومہ، اختر النساء اور جاں باز کو ناقدین ادب نے سراہا ہے۔ 'اختر النساء' کو اصلاحی ناولوں

کے زمرے میں رکھا جاتا ہے جس میں آزادیٔ نسواں پر بھی کافی زور ملتا ہے، اس ناول کی بنت میں ہندوستان کے مشترکہ معاشرے کو بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیوں سے گزرتے ہوئے دکھایا گیا ہے جو اس کا نہایت خوش آئند پہلو ہے۔

سجاد حیدر کے ایک اور ناول ''جاں باز'' کی مرکزی کردار بھی آزادیٔ نسواں کی علم بردار ہے۔ وہ سیاسی سرگرمیوں میں عملی دلچسپی لیتی ہے اور جددرجہ آزادی کی تحریک میں شامل ہوجاتی ہے۔ اس ناول میں بھی مشترکہ معاشرے کی فنکارانہ عکاسی ملتی ہے جو قابل قدر چیز ہے۔ نذر سجاد کی ہم عصر دیگر ناول نگار خواتین مثلاً طیبہ بیگم، حمیدہ سلطان، والدۂ افضل علی مسز عباس طیب جی اور صغریٰ ہمایوں مرزا کے ناولوں میں بھی ہندوستان کا مشترک معاشرہ اپنی گوناگوں خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا ہے۔ ان ناولوں میں اس عہد کے کرداروں کے مسائل و معاملات کے ساتھ ساتھ طبقہ اشرافیہ کی تہذیب و معاشرت بھی اپنی رعنائیوں اور سچائیوں کے ساتھ منعکس ہوتی ہے۔ مذکورہ خواتین ناول نگاروں کے بعد اس میدان میں جن دو اہم خواتین کے نام ابھرے وہ مسز عبدالقادر اور حجاب اسماعیل ہیں، اول الذکر کا تعلق شمالی ہند سے اور مؤخر الذکر کا جنوبی ہند سے تھا۔

حجاب اسماعیل شادی کے بعد شمالی ہند میں آگئیں اور حجاب امتیاز علی نام سے مشہور ہوئیں ان کے ناولوں کے کردار رومان و تخیل کی غیر حقیقی دنیا کے باشندے سہی لیکن ہندوستان کی مشترکہ تہذیب ان کے یہاں بھی اپنے جلوے دکھائے بغیر نہیں رہتی۔ اے آر خاتون، حمیدہ سلطان اور صالحہ عابد حسین وغیرہ کے ناولوں میں جس تہذیب و معاشرت کی عکاسی ملتی ہے وہ بظاہر مسلم تہذیب و معاشرت کے باوجود دراصل ہندوستانی مسلم تہذیب ہے جو صحیح معنوں میں مشترکہ تہذیب ہی کا روپ ہے۔ ان خواتین کے برعکس رضیہ سجاد ظہیر، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کے ناولوں میں جو مشترکہ تہذیب منعکس ہوتی ہے اس میں بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ ایک نیا طرز حیات اور مغربی افکار و اثرات کی آویزش نظر آتی ہے، جبکہ ان کے مقابلے میں جیلانی بانو، مسرور جہاں، صغریٰ مہدی اور آمنہ ابوالحسن وغیرہ کے یہاں نسبتاً کچھ روایتی انداز و اثر برقرار ہے۔

قرۃ العین حیدر بلاشبہ ایک بلند پایہ ناول نگار ہیں، جن کے ناولوں میں عظمت کے آثار نمایاں ہیں۔ ان کے طرز فکر اور اس کے تخلیقی اظہار کی سب سے بڑی طاقت مشترکہ تہذیب ہے جسے ایک آدھ ناقد نے دبی زبان سے ان کی کمزوری بھی کہا ہے۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ عہد حاضر میں اردو زبان کی سب سے بڑی اور اہم ناول نگار ہیں۔ ان کے تمام ناولوں میں مشترکہ تہذیب کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ آگ کا دریا سے لے کر چاندنی بیگم تک قرۃ العین حیدر کا کوئی بھی ناول اٹھا لیجئے ہر ایک میں یہی موضوع اپنی پوری آب و تاب، پورے جلال و شکوہ اور پوری حقیقت و افسانویت کے ساتھ کارفرما نظر آئے گا۔ دراصل قرۃ العین حیدر کو اس تہذیب سے بے پناہ محبت ہے، جو بقول ڈاکٹر عبدالسلام:

> ''ہندو اور مسلمان کا مشترکہ سرمایہ تھی جو ان کے سینکڑوں سال کے میل جول کا نتیجہ تھی اس آزادانہ میل جول نے یہاں کے ہندو مت اور اسلام دونوں میں ترمیمیں کر ڈالی تھیں۔ ہندو اور مسلمان نہ صرف ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے بلکہ مذہبی رسوم اور تہواروں میں بھی دل کھول کر حصہ لیتے تھے۔ ہولی، دیوالی، رام لیلا وغیرہ میں اس طرح حصہ لیتے تھے کہ اپنے مذہب کی پابندیوں کو بھی بھول جاتے تھے۔ اسی طرح محرم کے زمانے میں ہندو سبیلیں لگاتے تھے اور اہل بیت کے غم میں مرثیے لکھتے تھے۔ یہاں مسلمان شاعروں نے کرشن بھکتی کے گیت لکھے اور ہندو شاعروں نے حمد و نعت اور منقبت کے شعر اسی عقیدت کے ساتھ لکھے۔''

(بحوالہ: اردو ناول بیسویں صدی میں، از ڈاکٹر عبدالسلام، صفحہ 576-575)

قرۃ العین حیدر کے تمام ناول ہندوستان کی قابل فخر مشترکہ کلچر کے بہترین عکاس قرار دیے جاسکتے ہیں، بالخصوص آگ کا دریا، تو صرف ان ہی کا نہیں بلکہ اردو زبان کا ایک شاہ کار ناول مانا جاتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کو ملک کا سب سے بڑا ادبی انعام واعزاز بھارتیہ گیان پیٹھ پرسکار بھی تفویض کیا گیا تھا۔ ان کے ناول کئی زبانوں میں ترجمہ بھی کیے گئے۔ ان کے بعد نمایاں ہونے والی نسل کی تمام باشعور خواتین ناول نگاروں نے بھی مشترکہ ہندوستانی کلچر کی عکاسی کی روایت کو اپنے اپنے افکار و مشاہدات کی بنیاد پر وسعت دینے کی سعی کی ہے۔

□□□

Dr.shahina Tabassum
Sr. Asstt. Professor
Zakir Husain Delhi College (evening)
University of Delhi
Delhi-110002
Mob: +91-9818538776

محمد یونس ڈار

جدید اردو غزل میں خواتین کے مسائل کی عکاسی

جدید دور کی غزل
اپنی تخلیقیت میں بدلتے ہوئے
حالات اور نئے تقاضوں کی متحمل ہے
جو متنوع سرچشموں سے کسبِ فیض کے
ساتھ ہی اپنے دور کی سائنسی طرزِ فکر سے بھی
وابستہ ہے۔ نیز انفرادی شعور کی کارفرمائی اجتماعی
حوالوں سے رقم کرتی ہے۔ چنانچہ اس کی فکری و موضوعی بساط
نہ صرف نئے رجحانات و میلانات سے روشناس ہوتی ہے بلکہ تخلیقی
پیچ و تاب کے نئے ابعاد کا خلاصہ بھی ہو جاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اندرونی
طلسمات آرائی کا بیرونی نقش پذیری سے آپس داری بھی کمال کی
ہے۔ جدید دور میں انسان کے ترقیاتی کارناموں نے ان مسائل کو جنم دیا
جن کے خط و خال سے قبل از دور کی انسانیات بے خبر تھی۔ اس شکست و
ریخت کی صورتحال کا اظہار جدید غزل اپنے منفرد اور مختلف انداز میں کرتی
ہے۔ زندگی کی بے معنویت، غیر محفوظیت، مہملیت، جنسیت، نفرت،
اجنبیت وغیرہ وہ جدید کٹھن اور تلخ اندیش انسانی مسائل ہیں کہ جن کی
عکاسی جدید غزل نے اپنے عصری حسیت سے لبریز لہجہ میں کی ہے۔ ساتھ
ہی تخلیقی آزادی، فکری خود مختاری، حقیقت پسندی، تشکیک پرستی، وغیرہ بھی
جدید غزل کی تخلیقی آئینہ سامانی میں درج ہے۔ بنابریں اس سیاسی، سماجی
اور تہذیبی آشوب سامانی نے جدید انسان کو جہاں تب و تاب کی تپش سے
سرگرم رکھا وہیں غزل نے بھی اپنے تخلیقی سانچوں اور ڈھانچوں میں نئے
لامحدود امکانات کو شامل کیا تاکہ نئے دور کی کرب ناکی کا جواز شعری پیکر

میں
سامنے آئے۔
علاوہ ازیں ان تمام تر
سیاسی، سماجی، شخصی، نفسیاتی اور
معروضی مسائل کی تصویر کشی کی
جن سے جدید دور کا انسان
باہم دگر ہے۔ چنانچہ عورت
کے مسائل کو بھی اپنی تخلیقی بساط
کا حصہ بنالیا۔

جدید غزل میں عورتوں
کے مسائل کا اظہار بھرپور انداز

میں ہوا ہے۔عورت، جس کا تعلق افزائشِ نسل سے ہوتا ہے، جسے قربانی کی دیوی مانا جاتا ہے اور جسے کسی بھی قوم کے استقلال اور بقا کی ضامن سمجھا جاتا ہے۔عرصۂ دراز تک انسانی سماج میں ناانصافی کی شکار رہی ہے کہ اسے دوسرے درجے کی مخلوق سمجھا گیا، صرف جنسی تسکین فراہم کرنے کا آلہ تصور کیا گیا، اسے اظہارِ رائے کا حق تھا نہ تعلیم حاصل کرنے کی اجازت تھی۔ ہر چند کہ سرسید تحریک نے تعلیمِ نسواں پر بھی زور دیا تھا کہ تعلیمِ نسواں کے بغیر کوئی ملک، کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی۔لیکن عورت پھر بھی تخلیقی سطح پر پوری طرح سے اپنا وقار بحال نہ کرسکی۔ بعدازاں ترقی پسندوں نے عورت کو تعلیم کے ساتھ ساتھ میدانِ عمل میں بھی آنے کی دعوت دی تو اس کی زندگی میں مثبت تبدیلیاں آئیں کہ اب وہ بھی اپنے ذہنی خط وخال کی نمائش تخلیقی انداز میں کرنے لگی۔ نیز اپنے تخلیقی وژن سے زندگی، معاشرہ اور خود اپنے وجود کی بازیافت نسوانی زاویہ نگاہ سے پیش کیا اصل میں مرد اساس سماج میں عورتوں سے ہونے والا ناروا برتاؤ، حقوق کی پامالی، جنسی زیادتیاں وغیرہ جیسے مسائل کی عکاسی جدید تعلیم کے بعد اس وقت ہوئی، جب عورتوں کے تخلیقی اظہار کی آزادی کا نعرہ عالمی سطح پر بلند ہوا۔ چوں کہ اس تانیثی ڈسکورس کا مقصد بقولِ ورجنیا وولف، 'کون اس شاعرانہ دل کی تپش اور تشدد کی پیمائش کرسکتا ہے جو ایک نسوانی جسم میں مقید اور محصور ہے' تھا۔ جدید دور میں عورت میدانِ عمل میں آتے ہی اور دوسرے مسائل کی بھی شکار ہوگئی۔ اگرچہ مرد شعرا نے بھی وقتاً فوقتاً عورتوں کے مسائلان کے دکھ درد، ظلم وزیادتی کا ذکر کیا ہے اور کرتے بھی ہیں لیکن جو حدت و شدت اور تڑپ شاعرات کے طرزِ احساس میں ہے وہ فقیدالمثال ہے۔ جدید غزل گو شاعرات نے مرد اساس سماج میں عورت کے ساتھ ناانصافی اور ظلم وزیادتی کے تجربات کو نسائی لب ولہجہ میں پیش کیا تو عورت کی کرب ناک پسماندگی کا احساس ہونے لگا۔ تعلیمی مسائل سے لے کر معاشی مسائل تک عورت کے دکھ درد کا دکھڑا بھی ملحوظِ خاطر رکھا گیا۔ جن جدید شاعرات نے اپنی غزلوں میں عورتوں کے مسائل کی عکاسی کی ہے ان میں ادا جعفری، کشور ناہید، پروین شاکر، فہمیدہ ریاض، یاسمین حمید، شاہدہ حسن، مسعودہ حیات، سارا شگفتہ، عذرا عباس، ممتاز مرزا، نوشی گیلانی، ساجدہ زیدی، شہناز نبی، شفیق فاطمہ شعریٰ، اسما سعیدی، ترنم ریاض، شبنم عشائی وغیرہ کا نام قابلِ ذکر ہے۔

جدید غزل نے خواتین کا جو بنیادی مسئلہ بھرپور انداز میں پیش کیا ہے وہ عدمِ تشخیص کا مسئلہ ہے۔ تمام شاعرات کے غزلیہ کلام میں یہی مسئلہ سرفہرست ہے۔ اسی مسئلہ کو باقی تمام مسائل کا سرچشمہ مانا جاتا ہے۔ عورت جسے مرد مرکز معاشرہ میں صنفِ نازک کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اب اس معاشرہ میں گھٹن محسوس کررہی ہے۔ صدیوں کی قربانیوں کے باوجود بھی اسے اپنا وجود خطرے میں نظر آرہا ہے کہ مرد مرکز معاشرہ کا آئین ہی اس کے اقدار و افکار کے خلاف ہے۔ عدمِ آزادی اور گھٹن کا یہی وہ احساس ہے جو جدید غزل میں عورت کے ادراکِ وجود کے لیے ضمانت کی جنگ لڑتا ہے تاکہ ان تمام متداول رسم ورواج کی بیخ کنی ہوجائے۔ جن میں سب سے پہلے ایک عورت کی آزادی سلب کی جاتی ہے کہ اسے مرد کی رضامندی کے سامنے سرِتسلیم خم ہونا پڑتا ہے۔ اپنا گھر چھوڑ کر شوہر کا گھر آباد کرنا پڑتا ہے۔ یعنی اسے والد کے گھر پیدا اور شوہر کے گھر مرنا پڑتا ہے۔ تمام عمر گھر کو بنانے، سنوارنے اور سجانے کے باوجود بھی وہ شوہر کا ہی گھر کہلاتا ہے۔ چنانچہ وہ گھر کی تلاش میں عمر بھر احساسِ محرومی لیے پھرتی ہے۔ نیز اسے صابر وشاکر بن کر گرہستی کے مشکلات ومعاملات سے نبھا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اور پھر وہاں بھی:

بہت ہے بارشِ سنگِ ملامت
مگر ہم صورتِ کہسار چپ ہیں
(نوشی گیلانی)

متذکرہ بالا شعر میں 'بارشِ سنگِ ملامت' جہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مرد اساس معاشرہ میں عورت چہار دانگ جس ناقدری، ظلم وزیادتی اور

بے وقعتی کی شکار ہے کہ اور جس ناروا سلوک سے دوچار ہے۔ دراصل مذکورہ معاشرہ کے مروجہ رسم ورواج اور اقدار کا نتیجہ ہے وہیں مصرعہ ثانی میں 'صورتِ کہسار چپ' اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ عورت نڈر ہوکر ان تمام تر مسائل ومشکلات کا دیوانہ وار مقابلہ کرتی ہے جو اس پر روا رکھے گئے ہیں۔ ساتھ ہی اس احساسِ محرومی کا ادراک بھی ہوجاتا ہے کہ عورت اپنی بے اختیاری اور بے زبانی کے شدید احساس سے بھی لڑ رہی ہے۔ چند اور اشعار ملاحظہ فرمائیں؛

بے وفائی کا دلِ زار پہ الزام نہ رکھ
ہم نے اک عمر گزاری ہے وفاداری سے

(مسعودہ حیات)

ہم وفاؤں کی ردا اوڑھ کے چپ ہیں لیکن
آپ اک تازہ ستم روز ہی کرجاتے ہیں

(اسما سعیدی)

وہ چاند بن کے مرے ساتھ ساتھ چلتا رہا
میں اس کی ہجر کی راتوں میں کب اکیلی تھی

(پروین شاکر)

میں شمع بن کے جلتی رہی عمر بھر مگر
خود اپنے گھر کا دور اندھیرا نہ کرسکی

(نفیس بانو شمع)

اس طرح سے ایک عورت کے حقوق کی پامالی کا مسئلہ سامنے آجاتا ہے۔ ہر چند کہ جدید دور میں عورت مرد کے شانہ بہ شانہ چل کر کارزارِ حیات میں بھرپور طریقے سے اپنا دم خم دکھا رہی ہے اور دُنیا کی مختلف حکومتوں نے اس کی آبادکاری اور بہتری کے لیے قوانین بھی بنائے ہیں لیکن مشرقی سوسائٹی میں ابھی تک اس کے لیے ہنوز دلی دور است والا معاملہ ہے۔ گھر کی چار دیواری میں اس کو تنہائی کا شدید احساس ڈس رہا ہے کہ وہ بھیڑ میں تنہائی کا شکار نظر آرہی ہے۔ جدید دور کے صنعتی اور میکانکی تمدنی ہاؤ بھاؤ نے آدمی کو جہاں جذبات سے عاری مشین اور مادیت پرست بنایا وہیں اسے اپنے رشتوں ناطوں سے بھی دور کیا کہ اب اس کے پاس وقت ہی نہیں۔ یہی سبب ہے کہ جب سیاسی، سماجی اور معاشرتی رویوں میں تبدیلی آتی ہے تو عین ممکن ہے کہ تصورِ فرد بدل جائے اور اس سے وابستہ رشتوں کی نوعیتیں بھی۔ جب جدید دور کا آدمی اپنی عورت کو زیادہ وقت نہ دے سکا، اسے محبت کے دو بول نہ سنا سکا تو وہ تنہائی کا شکار ہوگئی:

میں گھر میں بھی اس سے ملتی کیسے
دیوار کھڑی تھی گھر کے اندر

(کشور ناہید)

عشق نے سیکھ ہی لی وقت کی تقسیم کہ اب
وہ مجھے یاد تو آتا ہے مگر کام کے بعد

(پروین شاکر)

اس کی پہچان کھوگئی آخر
اپنے ہی گھر میں وہ رہی تنہا

(شہناز نبی)

مرد کی پسند کا اس کی پسند بن جانا، ظلم وجبر سہہ کر بھی خاموشی اختیار لینا، گھر اور آفس میں بھی کام کرنا، بے چارگی، عدم تحفظ، مذہبی کٹر پسندی کا شکار ہونا وغیرہ ایسے مسائل ہیں جن سے آج بھی مشرقی سوسائٹی کی عورت کو اپنی شناخت معدوم ہونے کا خطرہ لاحق ہے۔ چنانچہ جدید غزل نے مذکورہ تمام مسائل کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا حصہ بنا کر عورت کی اہمیت اور مرد مرکز معاشرہ میں اس کی خاموشی کو زبان دی ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ لکھتے ہیں؛

''وہ معاشرہ جس کی کم وبیش نصف آبادی عورت پر مشتمل ہے محض اس لیے اسے اپنے حقوق اور آزادیوں سے محروم نہیں رکھا جاسکتا ہے کہ وہ عورت ہے۔ گویا وہ انسان نہیں کوئی اور مخلوق ہے۔ اس کے لیے اختیارات وقوانین کا محضر نامہ الگ، بازیابی کی شرائط علحیدہ، رد وقبولیت کے معیار جدا کیوں؟ صرف اس لیے کہ وہ عورت ہے۔ یہ سوال بار بار ہماری شاعرات نے اٹھایا ہے۔ انھیں اس ضابطۂ اخلاق سے سخت چڑ ہے جس پر جاگیرداری منشا اور رضا کے دستخط ثبت ہیں۔ وہ محض ایک زینت خانہ ہے۔ جنس عیش تو بن سکتی ہے، خود کار وخود ساز نہیں بن سکتی۔ گویا نام نہاد اخلاقی اور سماجی جبر اور دباؤ اس کی تقدیر ہے۔''

(ترجیحات: عتیق اللہ، ص 361)

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مرد اساس معاشرہ میں عورت کو بہت سے مسائل درپیش ہیں کہ اسے دوسرے درجے کی مخلوق سمجھ کر اس پر حق وحقوق کے وہ سب دروازے بند ہیں کہ جہاں سے وہ اپنی شناخت، اپنا آئین، اپنی زبان، اپنی آرزو، اُمنگ اور نئے معاشرے کے اس خواب کو شرمندہ تعبیر کرتی کہ جس کا علم لے کر جدید دور کی شاعرات نے اپنے تخلیقی اظہار میں طنز اور احتجاج کی لے کو تیز کیا ہے۔ غرض، ایک

ایسا جہاں کہ جہاں عورتوں کی تعلیم، پرورش، من پسند شادی، مساوی حقوق کی چہل پہل بھی ہو، عورت کی انا کا بھرم بھی قائم ہو، اسے رحمِ مادر میں ہی نہ مارا جاتا ہو، اور تو اور نہ اس کی ذات پر کسی بھی قسم کا لیبل ہو اور نہ ہی اس کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہو۔ اس تمام تر جدوجہد کا مقصد دراصل اس بیمار ذہنیت کا علاج تھا کہ جو ابھی بھی عورت کی زخمی روح کی پکار اور سینے کے سناٹے کو محسوس کرنے سے عاری ہے۔ یہ دراصل عورت کو اس کی طاقت کا احساس دلانے کی بھی جدوجہد ہے کہ وہ بڑی سے بڑی انسانی طاقت کو بھی زیر کرسکتی ہے۔ مرد کے استحصالی نظام میں اس کے جذبات کی ناقدری پر احتجاج بھی کرسکتی ہے اور اپنی بات منوا بھی سکتی ہے تاکہ ان بے شمار جوانیوں کا زیاں بچ جائے جو رسم رواج، ذات پات، خاندان، عزت کے نام پر آئے روز اپنی زندگیوں کا خاتمہ تو کرتی ہیں لیکن سودے اور سمجھوتے کا ساتھ نہیں دیتیں۔

لے جائیں مجھ کو مالِ غنیمت کے ساتھ عدو
تم نے تو ڈال دی ہے سپر تم کو اس سے کیا
(پروین شاکر)

سنبھل بھی لیں گے، مسلسل تباہ ہوں تو سہی
عذابِ زیست میں رشکِ گناہ ہوں تو سہی
(کشور ناہید)

رحمِ مادر میں ہی لڑکی کو ختم کرنے کا مسئلہ آج کے دور کا ایک سنگین مسئلہ ہے کہ اسے غیر کا مال سمجھ کر اس سے مکتی میں ہی عافیت تصور کی جاتی ہے۔ آج بھی برصغیر میں لڑکے کی پیدائش پر خوشی اور لڑکی کی پیدائش نفرت کا باعث بنتی ہے۔ اس کی اور بھی وجوہات ہوسکتی ہیں لیکن یہ وجہ ضرور ہے کہ لڑکی کی پرورش، تعلیم اور اس پر خرچہ کو بوجھ سمجھ کر اس لیے اہمیت نہیں دی جاتی ہے کہ اسے تو کوئی اور ہی گھر بسانا ہے جبکہ لڑکے کو بڑھاپے کا سہارا مان کر، وارث سمجھ کر لڑکی سے زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ جو لڑکی رحمِ مادر سے صحیح سلامت پیدا ہوتی ہے اس کے لیے دنیا میں مشکلات کا سامنا رہتا ہے نیز شادی کے بعد ہی وہ شوہر کے حدِ اختیار میں آجاتی ہے تو اپنی آزادی اور خودمختاری سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔ اسے اپنی شناخت کی معدومی کی پرواہ کیے بغیر ہر وقت سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔ نوکرانی یا خادمہ بن کر کام کرنا پڑتا ہے۔ انسانوں کا جبر سہنا پڑتا ہے۔ اب اگر سمجھوتہ نہ کیا اور کٹھ پتلی کی زندگی بسر کرنے پر آمادہ نہ ہوئی تو اسے سسرال کے ظلم وزیادتی اور طعن وتشنیع کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ اور کبھی کبھی بات طلاق، خلع، قتل اور مقدمہ تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ ساتھ ہی وہ لڑکیاں جو مذہب کی غلط تاویل، رسم ورواج، غربت، معاشی تنگ دستی، جہیز وغیرہ کی وجہ سے جلد شادی نہیں کرپاتی ہیں احساسِ کمتری اور شدید ذہنی، جسمانی اور جذباتی اذیت سے دوچار ہوجاتی ہیں تو پھر جنسی بے راہ روی، منشیات کا استعمال، خودکشی کی شکار ہوجاتی ہیں۔ جدید غزل نے عورت کی اس کیفیت کا اظہار مختلف تخلیقی پیکروں میں یوں کیا ہے:

طلاق دے رہے ہو عتاب و قہر کے ساتھ
مرا شباب بھی لوٹا دو میری مہر کے ساتھ
(ساجد سجنی)

عورت کو سمجھتا تھا جو مردوں کا کھلونا
اس شخص کو داماد بھی ویسا ہی ملا ہے
(تنویر سپرا)

جس کو تم کہتے ہو خوش بخت سدا ہے مظلوم
جینا ہر دور میں عورت کا خطا ہے لوگوں
(رضیہ فصیح احمد)

خود پہ یہ ظلم گوارا نہیں ہوگا ہم سے
ہم تو شعلوں سے نہ گزریں گے نہ سیتا سمجھیں
(بلقیس ظفیر الحسن)

غرض، جدید غزل عورتوں کے بنیادی انسانی حقوق کی بحالی، معاشی، سیاسی، سماجی استحصال، رسم ورواج اور مذہب کے نام پر ظلم و زیادتی، عدمِ شناخت، بے اختیاری، تعلیم، ناانصافی، جنسی بے راہ روی، غربت، جہیز، شادی، نوکری جیسے مسائل کی عکاسی کرتی ہے تاکہ مرد مرکز معاشرہ اور ادب میں ان کی شناخت معدوم نہ ہوسکے۔ ان تمام مسائل کی پیشکش میں جو شعری فضا قائم ہوتی ہے اس میں لطیف جمالیاتی پہلو ہونے کے باوجود طنز اور احتجاج کی لے بھی تیز ہے جو برہنہ سماجی صداقتوں اور پیچیدہ انسانی مسائل کے اظہار میں سچائی اور سادگی کا حسنِ اظہار بھی اپنے تخلیقی بطن میں محفوظ رکھتی ہے۔ کیونکہ غزل کی طرح عورت کو بھی معاشرہ جبر سے جینے نہیں دیتا لیکن اس کے اندر کا صبر اسے مرنے نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ غزل اور عورت دونوں برداشت اور صبر کی کوکھ میں پرورش پاتی ہیں۔

□□□

Mohd Younis Dar
Tujan
Pulwama-192301 (J & K)
Mob: 9797770422

سیدہ جنیفر رضوی

اردو شاعری کے یاور
شجاع خاور

دلی اردو شعر و ادب کا ایک قدیم ترین مرکز رہی ہے۔ یہاں اردو زبان کی پیدائش سے لے کر موجودہ دور تک ہزاروں شعرا نے جنم لیا اور گیسوئے شعر و ادب کو سنوارنے میں اپنا خون جگر صرف کیا ہے۔ دلی میں میر و غالب، ظفر و ذوق، نصیر و داغ جیسے قد آور شعرا نے اردو شاعری کے بال و پر کو سنوارنے اور نکھارنے میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ اس تاریخی شہر کے ایک اہم شاعر شجاع خاور ہیں، اردو زبان سے بے لوث محبت رکھنے والے شجاع خاور 23 دسمبر 1948 کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام شجاع الدین تھا لیکن ادبی دنیا میں شجاع خاور کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔

شجاع الدین المعروف شجاع خاور نے دلی میں ہی تعلیم حاصل کی۔ بی اے آنرز کے بعد انگریزی میں ایم اے کیا اس کے بعد سول سروسز کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور آئی پی ایس افسر بن گئے۔ اپنی منصبی ذمہ داریوں کو نبھانے کے علاوہ آپ کو شعر و شاعری سے بھی لگاؤ رہا ہے۔ یہ دلی کے ماحول کی وجہ سے بھی ہوسکتا ہے اور ان کے بھائی جو خود بھی شاعر تھے ان کی محبت کی وجہ سے بھی۔ شجاع خاور نے مصروف اور مشکل ترین زندگی کے باوجود اپنے جذبات اور احساسات کے اظہار کے لیے وقت نکالا۔ پولیس محکمہ سے فارغ ہونے کے بعد موصوف نے خود کو اردو زبان و ادب کے لیے وقف کر دیا۔

جدیدیت کے ابتدائی دور میں جن شعرا نے اپنا شعری سفر شروع کیا ان میں شجاع خاور ایک اہم نام ہے۔ 1964 کے بعد انھوں نے شاعری کی وادی میں باقاعدہ قدم رکھا اور اپنے احساسات کو زیب قرطاس کرنے لگے۔ شجاع کا ایک شعری مجموعہ ''مصرع ثانی'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جس کو اردو ادب کے باذوق قارئین اور ناقدین نے سراہا ہے۔ شجاع خاور نظم و غزل دونوں اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ابتداً وہ نظم کی جانب زیادہ متوجہ ہوئے تھے لیکن بعد ازاں غزل گوئی کو ہی اپنے احساسات کی نمائندگی کے لیے زیادہ موزوں پایا۔ موصوف نے اردو غزل

کے جدید و قدیم شعرا کا غایر مطالعہ کیا ہے۔جس سے ان کے فن میں وسعت، گہرائی اور گیرائی پیدا ہوئی۔شجاع خاور اردو غزل کے فنی رموز سے بخوبی واقف ہیں۔انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے اردو غزل کو نیا و تازہ لہجہ عطا کیا جو ان کی تخلیقی شخصیت کا غماز بھی ہے۔چند شعر ملاحظہ ہوں:

تکلف روز روز اچھا نہیں ہے
گلی میں بھی نہانا چاہیے تھا

حالات نہ بدلیں تو اسی بات پہ رونا
بدلیں تو بدلتے ہوئے حالات پہ رونا

یہ تو سبھی کہتے ہیں کوئی فکر نہ کرنا
یہ کوئی بتاتا نہیں ہم کو کہ کریں کیا
نہ منزل کو پتا ہوگا نہ رستوں کو خبر ہوگی
مسافر ایک دن آرام سے گھر بیٹھ جائے گا

شجاع خاور اردو غزل کا گہرا ادراک رکھتے ہیں۔انھوں نے اردو غزل کے اساتذہ کا خوب مطالعہ کیا ہے جس کی بدولت ان کی غزل اردو شاعری میں نئی وسعتیں پیدا کرتی ہے۔ان کی غزلوں میں نئے احساس کی فراوانی ہے اور اس احساس کو انھوں نے اپنے نمائندہ اسلوب کی بدولت اور بھی زیادہ دلکش بنایا ہے۔انھوں نے اپنے تجربات کو اپنے انداز اور منفرد اسلوب میں پیش کرنے کو ہمیشہ ترجیح دی ہے۔انھوں نے بنے بنائے رستوں پر چلنے کے بجائے خود ساختہ راہوں پر چل کر کامیابی حاصل کی ہے جو ان کی غزل گوئی کی اہم خوبی ہے۔شجاع خاور کے کلام کے مطالعہ کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ وہ زندگی کے مختلف و متنوع تجربات اور واردات کو بڑی آسانی کے ساتھ اپنے مخصوص انداز میں پیش کرنے میں قدرت رکھتے ہیں۔انھیں زندگی اور متعلقات زندگی کے ہر پہلو کو اجاگر کرنے اور اسے شعری قالب عطا کرنے میں ملکہ حاصل ہے۔شجاع خاور اپنے منفرد اسلوب کو اور دلکش بیان اور سحر انگیز ماحول عطا کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار:۔

تکلف چھوڑ کر میرے برابر بیٹھ جائے گا
تصور میں ابھی وہ پاس آ کر بیٹھ جائے گا

ہر اک زخم جائے گا میرے ہی ساتھ
نمک سب نے ہے میرا کھایا ہوا

گھر سے تو چلے آئے ہیں بازار کی جانب
بازار میں یہ سوچتے پھرتے ہیں کریں کیا

اظہار میں قوت ہے تو مل جائے گا موضوع
سوکھا نہیں پڑتا ہے تو برسات پہ رونا

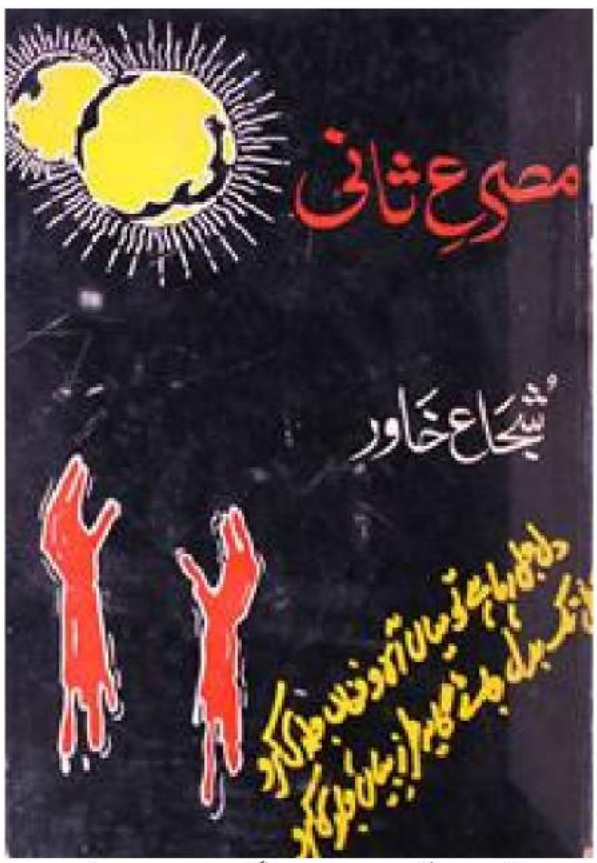

شجاع خاور اگرچہ جدید شاعر ہیں لیکن وہ اپنی روایتوں کے پاسدار بھی ہیں۔انھوں نے بزرگ شاعروں کے کلام سے بھی استفادہ کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں قدیم رسم و رواج اور جدید طرز احساس کی دلفریب آمیزش نظر آتی ہے۔موصوف نے اردو شاعری کے اساتذہ کے کلام سے اکتساب فیض کیا ہے اور اس کا اظہار بھی بے باکانہ انداز میں کرتے ہیں:۔

اب ملے ہیں دل و جاں اس کے شجاع خاور میں
پہلے غالب میں غزل کا تھا دل اور میر میں جاں

ذوق صاحب کو سخن فہموں سے آتا ہے حجاب
سارے الزام ہیں غالب کے طرفدار کے سر

کا لطف اگر اک انیس پر ہو جائے
تو پھر ہزار دبیروں سے کچھ نہیں ہوتا

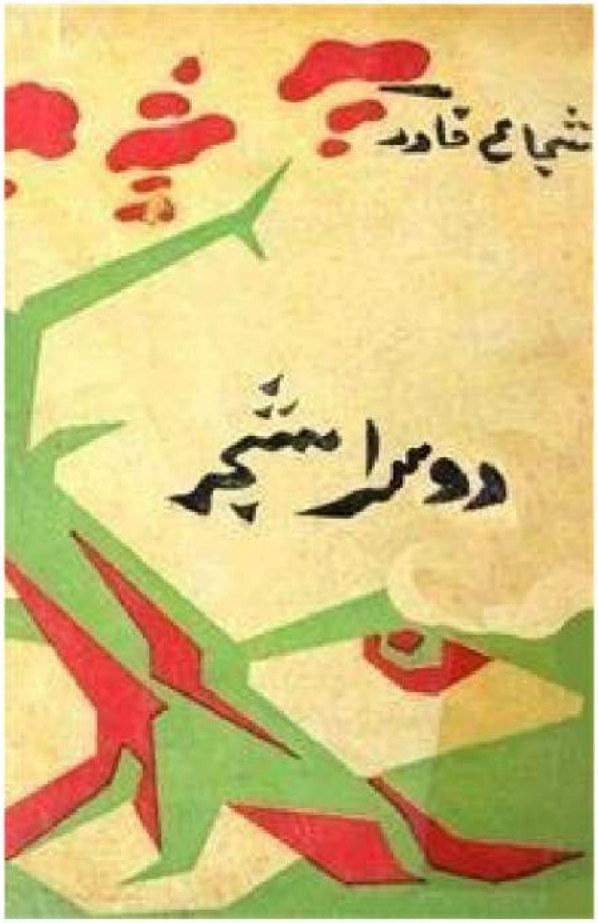

روایتی غزل کی لفظیات کو نئے معنوں میں استعمال کر کے شجاع خاور افہام و تفہیم کے نئے در وا کرتے ہیں۔ انھوں نے خود کو روایت کا اسیر نہیں کیا بلکہ عصر حاضر کے جدید اور نئے موضوعات کو بھی اپنے منفرد انداز میں بخوبی برتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ شجاع خاور کی غزل روایت اور جدیدیت کا حسین امتزاج ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ موصوف کی غزل گوئی میں جدت و ندرت اور روایت و جدیدیت کی پر کیف آمیزش کے پیش نظر پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''روایتی غزل میں سب خیریت ہی خیریت ہے۔ اس انبوہ میں تو جو چاہے بے کد و کاوش شریک ہو سکتا ہے لیکن نئی غزل میں پار پانا اور اپنی آواز کی بنا پر الگ سے پہچانا جانا اتنا ہی مشکل ہے۔ شجاع خاور اپنے اطراف کی غزل اور اس کی بندھی ٹکی لفظیات سے شدید طور پر نا آسودہ ہیں۔ کوئی بھی شاعر اطراف کی راہ پر تبھی نکلتا ہے جب وہ موجود اور مانوس سے سخت نا مطمئن ہو یا کسی داخلی اضطراب سے دوچار ہو یا طرفگی اور تازگی کی جمالیات مرتب کرنے کے لیے سب کچھ داؤ پر لگانے کو تیار ہو۔ شجاع خاور نے بغاوت کی راہ اتفاقاً نہیں ارادتاً اختیار کی ہے۔ لفظ جب تخلیق کی تپش سے گرماتا ہے تو معنی لو دینے لگتا ہے۔ شجاع خاور نے بنی بنائی پٹری پر چلنے سے انکار کیا اس لیے لفظیات وضع کرنا بھی ضروری تھا تاکہ عامیانہ تصورات کو چیلنج کیا جا سکے۔ غزل کی روایتی لفظیات پر اشرافیہ کے رکھ رکھاؤ کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ شجاع خاور نے پہلا کام یہ کیا کہ رسمیات کے رنگین پردوں کو الگ کر دیا۔ جہاں رسمیات اور مرصع کاری ہوگی وہاں بو رزوائیت بھی ہوگی۔ شجاع رسمیات اور فرسودگی اسالیب کے تئیں چونکہ بے حد حساس ہیں چنانچہ ان کے لیے اپنی انفرادیت کو منوانا اور ہر طرح کے ''ڈوکسا'' کو رد کرنا بے حد ضروری تھا''

(ہیں اہل خرد کس روش خاص پر نازاں۔ مشمولہ سہ ماہی ادب ساز، دہلی جنوری تا مارچ، 2015، ص90)

دل انسانی جسم کا لازمی جزو ہے اس کے تصور کے بغیر انسان کا وجود ناممکن ہے۔ یہی دل ہمارے شعرا کے یہاں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اس دل کے بارے میں ہر شاعر نے اپنے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ شجاع خاور نے بھی دل کے حوالے سے متعدد اشعار کہے ہیں دل اور دل کی دنیا کے اظہار کے لیے انھوں نے نئے نئے خیالات کو دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔ یہاں اس حوالے سے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں:

تم انتظام کرو گے بتاؤ کیا دل کا
یہاں تو خود نہیں معلوم مدعا دل کا

عجیب لوگ ہیں یہ دل کو کیا سمجھتے ہیں
طبیب جسم میں ڈھونڈا کیے پتہ دل کا

شجاع دل کی کہانی بس اب تمام کرو
بیان کرنے لگے ہیں ہما شما دل کا

خدا کو آزمانا چاہیے تھا
کسی کا دل دکھانا چاہیے تھا

خیال اچھا ہوا تو شعر بن کر آئے گا باہر
بہت اچھا ہوا تو دل کے اندر بیٹھ جائے گا

شجاع خاور کی غزل نئی غزل کی عمدہ مثال ہے، ان کے یہاں بھی جدید عصری حسیت کے اہم موضوعات جیسے تنہائی، بے یقینی، بے چینی، بے چارگی، محرومی، اجنبیت وغیرہ فنی وفکری چابکدستی کے ساتھ پائے جاتے ہیں لیکن وہ بیشتر جدید غزل گوشعرا کے برعکس ابہام اور لفظی بازیگری سے اجتناب کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں عصری حسیت کو سادگی اور سلاست کے ساتھ پیش کیا ہے، ان کے یہاں بنہایت سلجھے ہوئے الفاظ میں بڑے سے بڑا تجربہ بھی خوبصورت اور انوکھے انداز میں جلوہ افروز ہوتا ہے۔ جس سے ان کی غزل میں تازگی اور توانائی پیدا ہوگئی ہے۔ شجاع کی غزل میں فکر کی گہرائی اور گیرائی کے بے شمار پہلو موجود ہیں۔ وہ زندگی اور متعلقات زندگی کے بارے میں مسلسل غور وفکر میں محو رہتے ہیں اور جو کچھ محسوس کرتے ہیں اس کی عکاسی اپنی غزل میں بڑی بیساختگی کے ساتھ کرتے ہیں۔ الفاظ کے انتخاب اور استعمال میں بھی شجاع خاور کو کمال حاصل ہے۔ وہ زمانے کے نشیب وفراز کو مخصوص زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں اور جو کچھ محسوس کرتے ہیں اس کا اظہار کچھ اس انداز میں کرتے ہیں:۔

سرسری انداز سے دیکھو گے تو محفل ہی محفل
غور سے دیکھو گے تو ہر آدمی تنہا لگے گا

کہاں کہاں ہے خدا جانے رابطہ دل کا
دماغ سے نہیں ہو گا مقابلہ دل کا

تفنن کے لیے نام ونمو کی دوڑ میں ہیں ہم
ہمیں معلوم ہے نام ونمو سے کچھ نہیں ہوگا

اس شہر میں سب ٹھیک ہے کیا سوچ رہے ہیں
رونا ہے تو اپنے ہی خیالات پہ رونا

مخالف سے صلح و صفائی جو کی
کئی دوستوں کا صفایا ہوا

شجاع خاور کے کلام میں الفاظ کی ادائیگی برمحل اور برجستہ ہوتی ہے، موقع محل کی مناسبت سے نئے نئے الفاظ اور تراکیب بھی وضع کیے ہیں جو ان کے قادرالکلام ہونے کا بین ثبوت ہے۔ موصوف کے انداز بیان اور اسلوب کی شائستگی کے پیش نظر مجتبیٰ حسین رقم طراز ہیں:

''شجاع خاور نے بات کرنے کا ایک نیا سلیقہ، نیا لہجہ اور موضوعات کی طرف دیکھنے کا ایک نیا زاویہ نگاہ اپنایا ہے، انھوں نے یہ نکتہ بھی اٹھایا ہے کہ جو شاعری سچی ہوتی ہے وہ ممکن ہے کہ اچھی نہ ہو اور جو شاعری اچھی ہوتی ہے وہ ممکن ہے کہ سچی نہ ہو۔ اس شعری ادراک کے باعث ان کی شاعری میں اچھے پن اور سچے پن دونوں کا حسین امتزاج موجود ہے۔ شجاع خاور کی شاعری کا سب بڑا وصف شعر کے فنی اور معنوی لوازمات کی طرف ان کا بے تکلف اور کھلا ہوا زاویہ ہے، جسے وہ زیادہ سنجیدہ اور رنجیدہ بنانے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا لہجہ خود ساختہ تصنع اور اوڑھی ہوئی بناوٹ سے عاری ہے، وہ زندگی کو صحیح تناظر میں دیکھتے ہیں، بات کچھ ایسی بے تکلفی سے کہہ جاتے ہیں کہ بظاہر اس بات کا تعلق خوش مذاقی یا شگفتگی سے پیدا ہو جاتا ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو اس شگفتگی کے پیچھے ایک گہری سنجیدگی چھپی ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں بات کہنے کا سلیقہ ہمارے بہت کم شاعروں کے حصہ میں آیا ہے''

(مجتبیٰ حسین، داوین کے بعد، مرتب محمد اعظم، 1985۔ ص، 54۔55)

بہرکیف شجاع خاور 20/جنوری 2012 کو انتقال کر گئے، لیکن اردو غزل میں وہ نام ومقام رکھتے ہیں۔ جن کے لہجے کی نرمی، احساس کی شدت، فکر کی تازگی، خیال کی وسعت و ندرت، اظہار کی صلابت و حلاوت، موضوعات میں تنوع ایسی خوبیاں ہیں جن کو وہ بیک وقت بروئے کار لا کر اپنے تجربات کو غزل کا لبادہ پہناتے رہے ہیں۔ انھوں نے جو کچھ دیکھا جو کچھ محسوس کیا اس کو خوبصورت پیرائے میں اپنے مخصوص اسلوب میں بیان کیا ہے۔ ان کا کلام اردو شاعری کے سرمائے میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

□□□

Syeda Jenifar Rezvi
C/o. Syed Shakil Raza
Village: Jublee Tank
Lal Bagh
Distt. Murshidabad-742149 (W.B)

نازآفرین

کہکشاں پروین

کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ

اردو افسانے کو بجا طور پر استحکام عطا کرنے میں خواتین افسانہ نگاروں نے اپنا بھرپور رول ادا کیا اور اب بھی کر رہی ہیں۔ گذشتہ چند برسوں میں افسانے کی روایت میں قدرے تبدیلی آئی ہے۔ یہ تبدیلی تجریدی، علامتی اور استعاراتی سطح پر ہے۔ خواتین افسانہ نگاروں کی بات کی جائے تو ان میں کہکشاں پروین کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ تین دہائیوں سے زیادہ ادبی زندگی میں انھوں نے افسانے کی روایت کو وقت اور حالات کے بدلتے تناظر میں پیش کیا ہے۔ ان کا اپنا طرز بیان سہل اور عام فہم ہے۔ ان کے چار افسانوی مجموعے ''ایک مٹھی دھوپ''، ''دھوپ کا سفر''، ''سرخ لکیریں''، ''پانی کا چاند'' اردو افسانہ نگاری کی دنیا میں تحسین کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ تحقیق وتنقید پر دو مجموعے ''صالحہ عابد حسین بحیثیت ناول نگار'' اور ''منٹو اور بیدی۔ تقابلی مطالعہ'' بھی اشاعت پذیر ہو چکا ہے۔ ''شیشہ افکار'' اور ''نظریۂ ادب'' مضامین کا مجموعہ ہے۔ ''کیا رشتہ ہے میرا؟'' نثری نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ ڈاکٹر کہکشاں پروین کی تصنیفی خدمات ہیں۔ اس مضمون میں ان کے افسانوی مجموعہ ''مور کے پاؤں'' (2019) جو اکتیس افسانوں پر مشتمل ہے، اس کا تجزیہ مقصود ہے۔

''مور کے پاؤں'' میں معاشرتی حالات، ازدواجی زندگی، سماج کے اندر پائے جانے والے فرسودہ رسومات، ویمن امپاورمنٹ اور مرد اساس معاشرے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ بیشتر کہانیاں انھیں ایشوز پر مبنی ہیں۔ ان موضوعات میں جدت ہے جو سماجی سطح پر پھیلی ہوئی برائیوں، افواہوں اور اوہام پرستی کو بے نقاب کرتی ہیں۔ پہلا افسانہ ''کنیا پوجا'' میں ڈھونگی مذہبی پیشوا کی گندی نظروں کا تذکرہ ہے جو نوعمر لڑکیوں کی پوجا کے بہانے اپنی سطحی جذباتیت کی تسکین کرتا ہے۔ کہانی میں مصنفہ یہ باور کراتی ہیں کہ بیٹیوں کی حفاظت اور کفالت کی اصل ذمہ داری والدین پر ہے۔ اگر کوئی مذہبی پیشوا اِس کی ذمہ داری ہوَن یا پوجا کے ذریعہ عوامی مذہبی محفل سجا کر لیتا ہے تو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ان بیٹیوں کی دنیا سنور گئی نیز اس معاملے میں ان بچیوں کا کوئی قصور نہیں، وہ تو ابھی ان ناپاک نگاہوں سے یکسر انجان ہیں۔ قصوروار ان کے والدین ہیں جو مذہب کے نام پر اچھے برے کی تمیز کرنے سے گریز کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب کے ٹھیکہ داروں کے ذریعہ بیٹیوں کی پوجا کیے جانے سے انھیں نجات مل جائے گی۔

''توا کی عورت'' عورت کے فرائض اور ذمہ داریوں کا ایک لا

متناہی سلسلہ ہے جس کی ادائیگی میں عورت اپنی عمر کا بہترین حصہ لگا دیتی ہے۔اس کے باوجود اس کی کوششوں کو سراہا نہیں جاتا۔اس کی قربانیوں کی قدردانی نہیں ہوتی۔سہواً اگر کوئی کام رہ جائے یا طبیعت خراب ہو جائے تو شوہر اور سسرال والوں کی طرف سے سخت باز پرس کی جاتی ہے۔اس کی وفا داری، اطاعت گزاری، محنت و مشقت کا اعتراف تو دور کی بات ہے، تذکرہ بھی نہیں کیا جاتا۔اس افسانے میں مصنفہ نے عورت کی حیثیت کو تو اسے تمثیل دی ہے۔جس کی حیثیت محض Use and Throgh جیسی ہے۔ورشا کی پوری ازدواجی زندگی اسی فکر میں گزرتی ہے کہ کوئی نہیں تو کم از کم اس کا شوہر تو اسے سمجھے!اس ضمن میں مصنفہ رقم طراز ہیں:

''سفر کے آغاز میں کچھ خواہشیں، کچھ امنگیں اور زندگی کا بھرپور اعتبار زادِ راہ کے طور پر لے کر چلی تھی۔لیکن مسافت بڑھتی گئی، وہ قلاش ہوتی گئی اور اسے احساس بھی نہ ہو سکا کہ کب اس سفر کے ناگزیر موڑ نے اسے منزل سے ہمکنار کرنے کی بجائے راستے کا ایسا پتھر بنا دیا جہاں ہمیشہ اسے یہ دھیان رکھنا پڑتا ہے کہ اس کا وجود کسی کے لیے زخم کا باعث نہ بن جائے۔''

(تو اکی عورت، ڈاکٹر کہکشاں پروین، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس نئی دہلی، 2019، ص:136)

''ورشا کی زندگی محض اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں گزرتی ہے۔گھر کے سارے کام نمٹانے کے بعد اسے اپنے لیے کوئی وقت ہی نہیں ملتا کہ اپنی فکر کرے۔رفتہ رفتہ اس کی زندگی محض ایک مشین کی طرح ہوگئی۔جب جس کی فرمائش آئی اسے مشینی انداز میں پورا کر دیا۔جذبات و احساس سے عاری ایسی زندگی کی تمنا کسی عورت کی نہیں ہوتی مگر بعض شوہر ایسے ہوتے ہیں جو عورت کو گھر کی لونڈی سمجھتے ہیں۔یہاں عورت کے خواب بکھر جاتے ہیں۔اس نے اپنی زندگی کو لے کر جو سپنے سنجوئے تھے اس کی کوئی رمق اسے نظر نہیں آتی، نظر آتی ہے تو صرف فرمائشوں کی ایک لمبی قطار۔''

اسی طرح افسانہ ''ریزہ ریزہ'' میں بھی ورشا کی زندگی محض اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں گزرتی ہے۔گھر کے سارے کام نمٹانے کے بعد اسے اپنے لیے کوئی وقت ہی نہیں ملتا کہ اپنی فکر کرے۔رفتہ رفتہ اس کی زندگی محض ایک مشین کی طرح ہوگئی۔جب جس کی فرمائش آئی اسے مشینی انداز میں پورا کر دیا۔جذبات و احساس سے عاری ایسی زندگی کی تمنا کسی عورت کی نہیں ہوتی مگر بعض شوہر ایسے ہوتے ہیں جو عورت کو گھر کی لونڈی سمجھتے ہیں۔یہاں عورت کے خواب بکھر جاتے ہیں۔اس نے اپنی زندگی کو لے کر جو سپنے سنجوئے تھے اس کی کوئی رمق اسے نظر نہیں آتی، نظر آتی ہے تو صرف فرمائشوں کی ایک لمبی قطار۔ایسے میں ورشا سوچتی رہ جاتی:

''فرائض کے ٹیڑھے میڑھے راستے، زندگی کے پیچیدہ نشیب و فراز، راکیش کی غضب ناک نگاہیں اور اپنا وجود لمحہ لمحہ پانی میں تبدیل ہوتا ہوا۔۔۔''

(ریزہ ریزہ، ڈاکٹر کہکشاں پروین، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس نئی دہلی، 2019، ص:121)

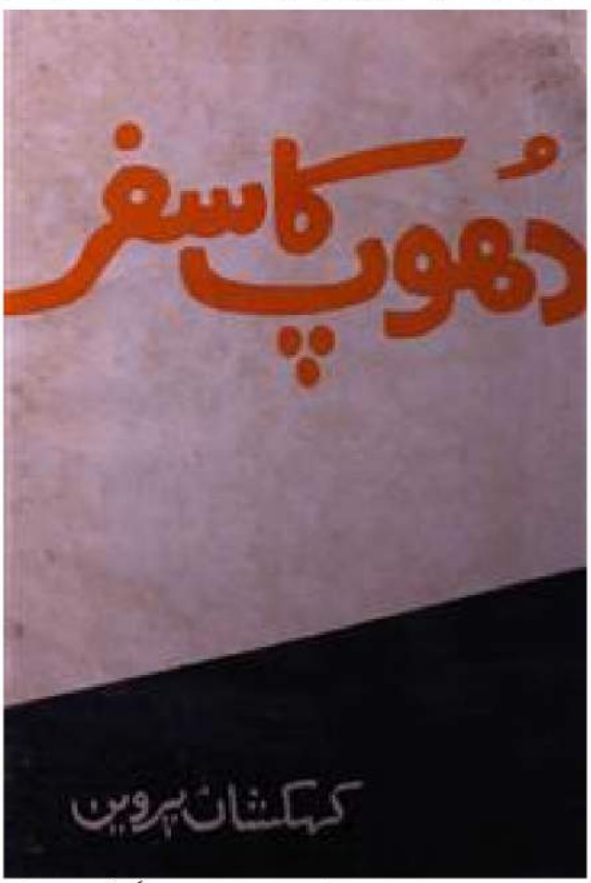

''عورت'' افسانہ میں کہکشاں پروین نے زندگی کی مسرتوں کو موضوع بنایا ہے۔اس کے مرکزی کردار اومیش اور مونا ہیں۔دونوں ایک دوسرے سے والہانہ محبت کرتے ہیں۔محبت کے معاملے میں مونا بڑے ناز

"عورت" افسانہ میں کہکشاں پروین نے زندگی کی مسرتوں کو موضوع بنایا ہے۔ اس کے مرکزی کردار اومیش اور مونا ہیں۔ دونوں ایک دوسرے سے والہانہ محبت کرتے ہیں۔ محبت کے معاملے میں مونا بڑے ناز و ادا دکھاتی ہے۔ اپنے شوہر کے جائز فطری خواہش کو پورا کرنے کے لیے مونا کی نت نئی فرمائشیں پوری کرکے اومیش تھک چکا ہے باوجود وہ مونا کو نا نہیں کہتا۔ اس کی دلجوئی کا پورا خیال رکھتا ہے"

وادا دکھاتی ہے۔ اپنے شوہر کے جائز فطری خواہش کو پورا کرنے کے لیے مونا کی نت نئی فرمائشیں پوری کرکے اومیش تھک چکا ہے باوجود وہ مونا کو نا نہیں کہتا۔ اس کی دلجوئی کا پورا خیال رکھتا ہے۔ بات تب بگڑتی ہے جب مونا اومیش کو مسلسل ٹالے جاتی ہے اور تب وہ ناراض ہوکر پارک میں چلا جاتا ہے۔ جہاں اس کی ملاقات ایک اجنبی عورت سے ہوتی ہے جو پیسے کے عوض اومیش سے اپنے حسن کا سودا کرتی ہے۔ یہ بات اومیش کے لیے کسی ناگہانی آفت سے کم نہیں وہ فوراً اپنے گھر کی راہ لیتا ہے۔ اس کے دماغ میں وقتی طور پر یہ خیال گردش کرنے لگتا ہے کہ بیوی اور طوائف میں کیا فرق ہے؟ دونوں کچھ لیتی ہیں تب کچھ خواہش پوری کرتی ہیں۔ لیکن مونا تو ایک بیوی کی حیثیت سے ناز وادا دکھاتی ہے۔ وہ اومیش کے ساتھ وفادار ہے۔ اس کے گھر کی نگراں ہیں۔ بعد میں اومیش کو بھی اس بات کا اندازہ ہو تا ہے اور وہ مونا کی وفا شعاری پر سرشاری محسوس کرتا ہے۔ اس کہانی میں کہکشاں پروین نے زوجین کے حقوق کو بڑی مہارت سے پیش کیا ہے۔

"داتا" کی مرکزی کردار سریا ہے۔ کہانی میں مصنفہ نے بیوی اور ماں کی حیثیت سے عورت کی اطاعت شعاری، تیمارداری، وفاداری اور کفالت کو پیش کیا ہے۔ سریا مسلسل دو برس تک اپنے شوہر کا علاج کراتی ہے۔ ساس سسر کی خدمت کرتی ہے۔ بچوں کی پرورش کرتی ہے۔ شوہر کی موت کے بعد گھر کی ساری ذمہ داری اس پر آ جاتی ہے۔ اسے یہی فکر ستائے رہتی ہے کہ اب کیا ہوگا؟ لیکن عورت جب اپنی ذمہ داریوں کا احساس کر لیتی ہے تو اس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں رہتا۔ پہلے پہل تو سریا کھیا کے گھر کام کے لیے جانے لگتی ہے لیکن اسے مالکن کی طرف سے پورا دن کام کرنے کے بعد اتنا کم اناج ملتا ہے جس سے اس کا پیٹ بھی نہیں بھرتا ایسے میں بچوں اور ساس سسر کا مسئلہ کیسے حل ہوتا۔ اس پر مستزاد یہ کہ مالکن کی طرف سے گالی گلوج اور بے عزتی کی جاتی۔ جب کھیا نے اس کی زمین پر خود کھیتی شروع کر دی اور بدلے میں اسے صرف چار ماہ کا اناج بھیج دیا جو اُن کے گذر بسر کے لیے بہت کم تھا۔ مالکن نے بھی گھر کے کاموں سے منع کر دیا تو اس کے پاس سوائے اپنی مدد آپ کے کوئی راستہ نہیں بچا اور سریا نے اسی پر عمل کیا۔ اب سریا کی زندگی میں بڑا بدلاؤ آتا ہے۔ اس کی خود اعتمادی اسے حوصلہ بخشتی ہے۔ سریا کے عزت نفس نے اب یہ گوارہ نہ کیا کہ وہ کھیا اور اس کی بیوی کی جی حضوری کرے۔ اس نے اپنے عزائم کو مجتمع کیا اور خود کھیتی کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوگئی۔ سریا کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"ہل لے کر کیا کروگی؟ اب تو کھیا کے آدمی کھیتی کریں گے۔"

سرجو بولا۔

"نہیں اپنی جمین (زمین) پر ہم کھیتی کریں گے۔" سریا مضبوطی سے بولی۔

"یہ تو مردوں کا کام ہے تجھ سے نہ ہوگا" سرجو نے ٹالا۔

"اکیلے ہم سات جانوں کو دو سال سے بھگت رہے ہیں۔ جندگی کے بوجھ سے ہل کا بوجھ کم ہوتا ہے بھیا۔ دھرتی میا کچھ تو رحم کرے گی۔" سریا نے آنسوؤں سے کہا۔"

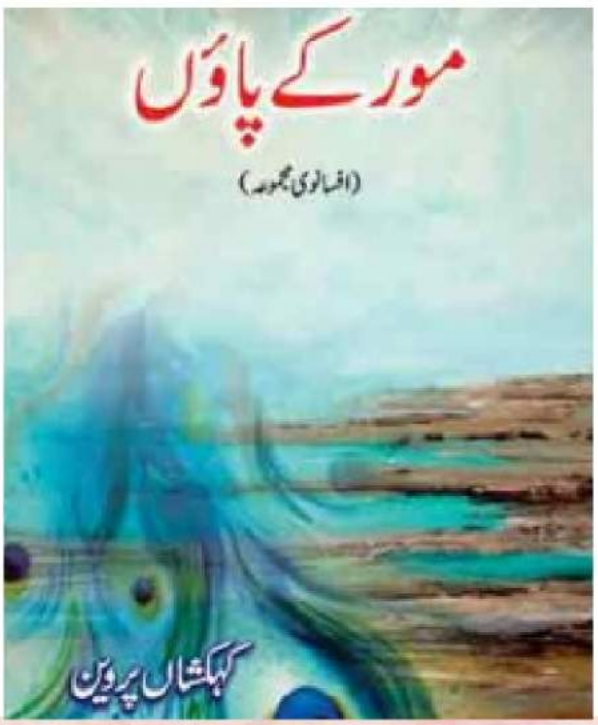

کہانی میں نیا موڑ آتا ہے اور دبی کچلی کمزور سریا گاؤں والوں کے لیے ویمن امپاورمنٹ کی مثال بن جاتی ہے۔ وہ اپنی زمین پر خود کھیتی کرتی ہے۔ لیکن کھیا اور مذہبی پیشواؤں کو عورت کا ہل چلانا منحوس لگتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہوں:

''سن کس کے حکم سے کھیتی کر رہی ہے؟'' کھیا رعب دار آواز میں بولا۔

''حکم کس کا مالک، کھیت تو میرا ہے۔'' سریا کی آنکھوں میں بغاوت اور سرکشی کے شعلے چمک رہے تھے۔

یہ تیرا کام نہیں ہے'' کھیا کڑک کر بولا۔

''اپنا کنبہ پالنا میرا کام ہے تو کھیت جوتنے کون آئے گا؟''

''اس گاؤں میں عورت کا ہل چلانا منحوس مانا جاتا ہے۔ تجھے نہیں معلوم یہ جرم ہے۔ عورت ہل چھوتی ہے تو سوکھا پڑ جاتا ہے۔ آسمان تو ابھی سے آگ اگل رہا ہے۔ تو پورے گاؤں کو زندہ جلائے گی کیا؟ کھیا تیز آواز میں کہہ رہا تھا۔''

''مجھے کھیتی کرنے دو بھیا۔ آج سریا بے خوف تھی۔ زمین کے جس ٹکڑے پر وہ کھڑی تھی وہ اس کا اپنا تھا۔ اس کے قدموں کو مضبوط دھرتی کا سہارا تھا۔''

''.....استری کا ہل چلانا گاؤں کے لیے نحس ہے سوکھا پڑے گا۔ کال ہوگا۔ پورا گاؤں اناج کے لیے ترسے گا۔ پانی کی ایک ایک بوند کے لیے تڑپے گا۔ ہٹاؤ اسے۔ پنڈت کی ہدایت پر کئی لوگ آگے بڑھے۔''

''نہیں جائیں گے ہم۔ سب بے کار بات ہے۔ ڈھونگی چھچے ہیں سب۔'' سریا بلند آواز میں چلانے لگی۔

''ڈھونگی ہے۔ ٹھگ ہے یہ پنڈت، بوڑھا لالچی کھیا کا چچیہ۔'' سریا نفرت سے کہے جا رہی تھی۔''

(مور کے پاؤں، ڈاکٹر کہکشاں پروین، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس نئی دہلی، 2019ء: 183-185)

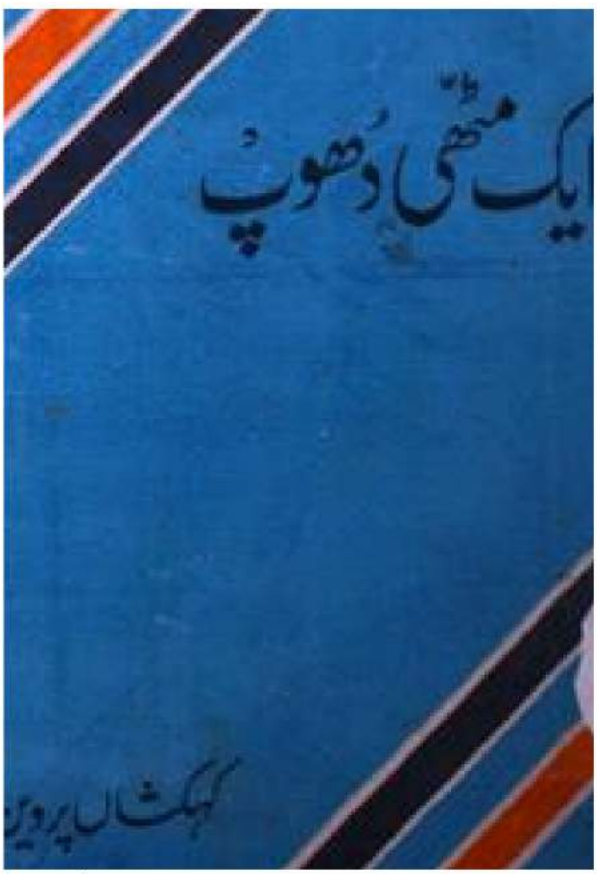

سریا کے ذریعہ مصنفہ نے عورت کے تئیں اوہام پرستی کی پرزور تردید کی ہے۔ عورت دبی کچلی رہے تو سماج کے ٹھیکہ دار اور دولت مندوں کو اچھا لگتا ہے۔ ان کی مردانگی کی تسکین ہوتی ہے لیکن یہی عورت جو کہیں ماں ہے کہیں بیوی اور کہیں بیٹی۔ وہ اپنے عورت ہونے کا احساس دلائے اور اپنی ذات کا ثبات قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرے تو اس کے ساتھ

انسانیت کو شرمسار کرنے والا رویہ اختیار کیا جاتا ہے۔ وہ گھر داری کا بوجھ اٹھائے لیکن سماج میں اپنی بقا کو قائم رکھنے کی کوشش کرے تو سزا کی مستحق ٹھہرائی جاتی ہے۔ جب عورت مظلومی وستم آرائی کی مخالفت کرتی ہے تو اس کا سر بھوڑا جاتا ہے۔ کان کاٹ دیئے جاتے ہیں اور اتنا مارا جاتا ہے کہ جسم خون سے لہولہان ہو جاتا ہے۔ اس حال میں گاؤں والوں کی مدد بھی نہیں ملتی۔ اس وقت کسی نے نہ سوچا کہ وہ بیوہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کی ماں ہے۔ بوڑھے ساس سسر کا واحد سہارا ہے۔ اور سب سے بڑھ کر ایک عورت ہے جس کی پوجا کی جاتی ہے۔ کہانی میں سماج میں اس متضاد کیفیت کی عکاسی ملتی ہے۔ مصنفہ نے سماج کے دورخے پن کو حقیقی طور پر پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

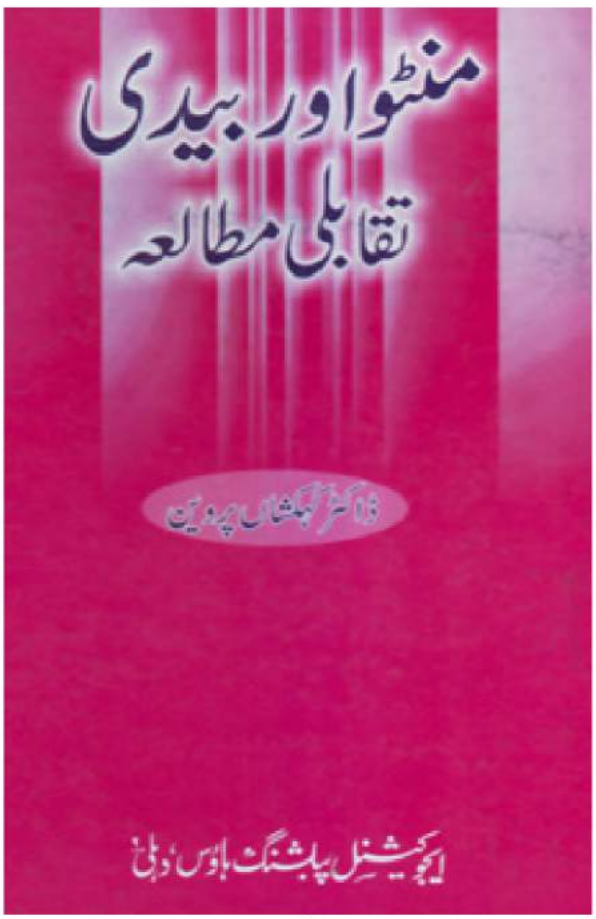

''مور کے پاؤں'' افسانوی مجموعہ کا آخری افسانہ ہے۔ افسانے کا موضوع اخلاقی قدروں کا زوال ہے۔ آصف اور مونا کے ذریعہ ازدواجی زندگی کی ناہمواریاں بیان کی گئی ہیں۔ جب انسان کے دل سے خوف خدا نکل جاتا ہے تو وہ اپنے کو حاکم سمجھنے لگتا ہے اور معاملہ جب بیوی کے ساتھ ہو تو اس کی حیثیت کو بعض مرد کہاں قبول کرتے ہیں؟ مونا تعلیم یافتہ، مہذب، سلیقہ شعار اور سلجھے خیالات کی عورت ہے۔ جس کا شوہر بدزبان، بدتمیز اور بیوی کی تحقیر کرنے پر فخر محسوس کرتا ہے۔ جس کے اندر احساس برتری ہے۔ اسی وجہ سے وہ ہر دفعہ مونا کو کمتر ثابت کرنے میں لگا رہتا ہے۔ اسے ذہنی اذیت میں مبتلا کر کے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ اپنے جذبوں کی تسکین کرتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ ایک عورت جو اس کی بیوی بھی ہے اس سے بڑھ کر ثابت ہو! مونا کو جب اس کے بچے الگ رہنے کے لیے کہتے ہیں تب وہ خود کو بے بس محسوس کرتی ہے۔ مشرقی قدریں اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ وہ آزاد ہو کر بھی غلام ہے اور یہی غلامی اسے نفسیاتی بیماری میں مبتلا کرتی ہے۔ مونا اکثر سوچتی ہے انسان تو اشرف المخلوقات ہے پھر ایسا کیوں؟ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''آخر سماج کس لیے بنا ہے، دنیا کی تعمیر کیوں کی گئی۔ گناہ ثواب، جنت وجہنم اور صحیح غلط کا معیار کیوں مقرر کیا گیا ہے۔ خدا نے تو اپنے بندوں کو صحیح راستہ اختیار کرنے کے لیے ہر کاوش کی۔ اس نے جنت کی آسودگیوں کا لالچ جہنم کی دہکتی ہوئی آگ کا خوف، قبر کے مختلف نوعیت کے عذاب، یہ تمام حقیقتیں سامنے لاکر انسان کو صحیح سمت کا شعور دیا تاکہ وہ اس کی بنائی ہوئی سرزمین پر کوئی ظلم روا نہ رکھے، کسی رشتے کی پامالی نہ کر سکے اور انسان کے حقوق پہچانے۔....''

(مور کے پاؤں، ڈاکٹر کہکشاں پروین، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس نئی دہلی 2019، ص 209)

ڈاکٹر کہکشاں پروین ایک عرصے سے اردو افسانہ نگاری کی دنیا میں افسانہ نگاری کر رہی ہیں۔ ''مور کے پاؤں'' ان کا چوتھا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس میں شامل چار افسانے ''ریزہ ریزہ، تو اکی عورت، شناخت اور داتا'' افسانوی مجموعہ ''پانی کا چاند'' میں بھی شامل ہیں۔ زندگی سے قریب، زندگی کے مسائل، پیچیدگیوں اور مشاہدوں کو بیاں کرنے والا یہ مجموعہ اردو افسانوں سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کے لیے بہترین تحفہ ہے۔ مجھے امید ہے جھارکھنڈ میں اردو افسانے کی روایت کو مستحکم کرنے میں کہکشاں پروین کا نام خواتین کے حوالے سے سب میں نمایاں ہوگا۔

□□□

Naaz Aafreen
Senior Research Fellow
Dept of Urdu, Ranchi University
Ranchi-834009 (Jharkhand)
Email:naaza55@gmail.com

رمضان پیکیج

رخسانہ نازنین

''ممتاز۔۔۔تم اب کام پر مت آیا کرو۔!''

''کیوں بی بی جی؟''

''سنا نہیں کل شام ہی لاک ڈاؤن کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ یہ وباء بڑی خطرناک ہے۔ اس لیے احتیاطاً سب کو اپنے گھروں میں بند رہنا ہوگا۔تم بھی اپنے گھر جاؤ اور آرام کرو۔!'' یہ کہہ کر فوراً نجمہ بیگم نے دروازہ بند کر لیا۔

''مگر بی بی جی کام پر نہیں آؤں گی تو میرا گھر کیسے چلے گا؟'' وہ گھبرا کر کہنا چاہتی تھی مگر بند دروازہ دیکھ کر اس کی آواز گلے میں ہی اٹک کر رہ گئی۔

بوجھل قدموں سے وہ دوسرے گھروں کی طرف چل پڑی۔مگر سبھی نے اسے دروازے سے ہی لوٹا دیا۔

''تم نہ جانے کتنے گھروں میں کام کرتی ہو! کس کس کے رابطے میں رہتی ہو۔۔۔۔!لہٰذا ان حالات میں تمھیں گھر میں آنے اور کام کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔! تمھاری چھٹی۔۔۔! جب تک کہ پوری طرح اس وباء کا خاتمہ نہ ہو جائے۔!''

اکرام صاحب کی بہو نے تیکھے لہجے میں کہا تو اسے حالات کی سنگینی کا احساس ہو گیا۔کبھی اپنے ہاتھوں سے ایک گلاس نہ دھونے والی بہو بیگم اسے غیر معینہ مدت کی چھٹی دے رہی تھیں۔!

سبھی گھروں میں یہی بھانت بھانت کی بولیاں تھیں۔دس منٹ کی تاخیر پر آسمان سر پر اٹھانے والی خواتین اسے کام پر آنے سے منع کر رہی تھیں۔!

کسی گھر میں کام ہی نہ کیا تو کچھ بچا کھچا کھانا بھی نہ ملا۔وہ مایوس، خالی ہاتھ گھر لوٹنے لگی۔۔

''اب کیا ہوگا۔؟ کیسے گزارہ ہوگا؟'' گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی۔

گھر میں داخل ہوئی تو انور نیند سے بیدار ہو چکا تھا۔اسے دیکھ کر چونک گیا۔

''ارے اتنی جلدی کیسے چلی آئی؟''

''چھٹی مل گئی ہے۔! وبا کے ڈر سے اب کوئی بھی کام نہیں کروانا چاہتا۔کسی نے گھر کے اندر آنے نہ دیا جیسے میں کوئی اچھوت ہوں۔ میرے چھونے سے کہیں ان کو کورونا نہ ہو جائے!''

اس کے لہجے میں طنز بھی تھا، تلخی بھی اور مایوسی بھی۔!

انور ایک گہری سانس لے کر بیڑی سلگانے لگا۔

''چل اب چائے تو پلا دے۔ میرا کام بھی بند اور تیرا کام بھی بند! بھوکے مریں گے اب سب کے سب!''

انور یومیہ مزدوری کرتا تھا۔ دن بھر کی محنت کے بعد جو اجرت ملتی آدھی شراب کی نذر ہو جاتی اور بچی کھچی ممتاز کے ہاتھ پر دھر دیتا اور جس دن کام نہ ملتا اس سے روپے مانگنے لگتا اور نہ دینے پر مار پیٹ پر اتر آتا اور زبردستی چھین لیتا۔ ممتاز تین چار گھروں میں کام کرتی۔ جھاڑو پونچھا، کپڑے، برتن دھوتی۔ بچا کھچا کھانا بھی مل جاتا جس سے ان سب کا پیٹ بھر جاتا۔ تنخواہ سے کمرے کا کرایہ ادا ہو جاتا۔ مفلسی کے سائے گہرے تھے۔ کسی طرح زندگی گزر رہی تھی کہ یکا یک یہ آفت ٹوٹ پڑی۔ سب لوگ گھروں میں محصور ہو گئے۔ ایک دوسرے سے کترانے لگے۔ سارے کام کاج ٹھپ ہو چکے تھے۔ مگر بھوک کو تو کوئی چھٹی نہ ملی تھی! وہ تو برابر لگ رہی تھی اور بے چین کیے جا رہی تھی۔!

انور سے چھپا کر اور پیٹ کاٹ کاٹ کر جو روپے بچا رکھے تھے وہ اس وقت کام آ گئے۔ کسی طرح ایک، دو ہفتے تک گزارہ ہو گیا۔ ہر دن وہ نئی امید کے ساتھ بیدار ہوتی کہ شاید آج لاک ڈاؤن ہٹا لینے کا اعلان ہو جائے۔ مگر وہ تو شیطان کی آنت کی طرح طویل ہی ہوتا جا رہا تھا۔ وبا کا خوف اپنی جگہ مگر سب سے بڑا مسئلہ بھوک تھی۔ بچے بھوک سے بلبلانے لگتے تو وہ تڑپ اٹھتی۔ انور تو سدا کا بے حس تھا۔ وہ تو ہاتھ پاؤں مارنے سے رہا، اسے سب کچھ بیٹھے بٹھائے چاہیے تھا۔! ممتاز نے کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلایا تھا۔ ہمیشہ محنت کی روٹی ہی کمائی اور کھائی مگر اب وہ بھی میسر نہ تھی۔۔۔

شام ڈھل رہی تھی۔ آج صبح سے وہ سب بھوکے تھے۔

''امی۔۔ کتنی اچھی خوشبو آ رہی ہے۔!'' گڈی نے کہا تو وہ چونک گئی۔

اس کے مالکِ مکان خان صاحب کے گھر سے پکوان کی اشتہا انگیز خوشبوئیں آ رہی تھیں جو معصوم بچوں کو للچا رہی تھیں۔ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

خان صاحب کے بیٹوں نے اپنے گھر میں خوب رونق لگا رکھی تھی۔ دوستوں کو اکٹھا کر کے شب و روز دھما کہ چوکڑی مچائے رکھتے، کیرم کی بازیاں، چائے کے دور، سگریٹ کے مرغولے اڑاتے بے فکر، خوش باش ہوٹلوں میں کھانے کے شوقین نوجوان لاک ڈاؤن کے سبب اب گھر کو ہی ہوٹل بنائے ہوئے تھے۔ روز نت نئے پکوان ہوا کرتے۔ بریانی کی مہک ان سب کی بھوک اور بھی بڑھا دیتی۔

''امی۔ بہت بھوک لگی ہے۔!'' چھوٹو کا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ ممتاز کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''لگی ہوگی میرے بچے۔ تھوڑا صبر کر لے۔ میں ابھی کچھ بناتی ہوں۔'' وہ کچن میں گئی۔ خالی ڈبے اس کا منھ چڑا رہے تھے۔ تھوڑے سے چاول تھے۔ اس نے اسی میں نمک، مرچ ڈال کر تل دیا تو بچوں نے خوشی سے کھا لیا۔

''امی۔ یہ بھی بریانی جیسی لگ رہی ہے۔!''

''بڑی کٹھن آزمائش تھی۔ اپریل کی چلچلاتی دھوپ میں وہ سب دو میٹر کے فاصلے سے بنائے گئے دائروں کے نشان کے اندر بیٹھی اپنی باری کا انتظار کر رہی تھیں۔ ممتاز شرم اور غیرت سے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ مفلسی کے اس تماشے کی بڑھ چڑھ کر تصویر کشی ہو رہی تھی۔ کئی گھنٹوں کے انتظار کے بعد اسے بھی ایک کٹ مل گئی۔ اللہ کا شکر ادا کیا اور گھر پہنچی تو بچے خوشی سے کٹ پر ٹوٹ پڑے کہ دیکھیں کیا کیا ملا ہے۔! اس رات اس نے کھچڑی بنائی سب نے سیر ہو کر کھایا۔ بچوں کے آسودہ چہرے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔''

چھوٹی نیہا نے معصومیت سے کہا تو ایک بار پھر ممتاز کی آنکھیں برس پڑیں۔ اس نے سوچ لیا اب غیرت کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا ہی پڑے گا۔ وہ مزید بچوں کو بھوک سے بلبلاتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔!

دوسرے دن سے وہ راشن کٹس کی تقسیم کے مراکز کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگی۔ پڑوس کی کچھ عورتوں نے اسے اپنے ساتھ لے جانے کا وعدہ کیا۔

بڑی کٹھن آزمائش تھی۔ اپریل کی چلچلاتی دھوپ میں وہ سب دو میٹر کے فاصلے سے بنائے گئے دائروں کے نشان کے اندر بیٹھی اپنی باری کا

انتظار کررہی تھیں۔ ممتاز شرم اور غیرت سے زمین میں گڑی جارہی تھی۔ مفلسی کے اس تماشے کی بڑھ چڑھ کر تصویر کشی ہورہی تھی۔ کئی گھنٹوں کے انتظار کے بعد اسے بھی ایک کٹ مل گئی۔ اللہ کا شکر ادا کیا اور گھر پہنچی تو بچے خوشی سے کٹ پر ٹوٹ پڑے کہ دیکھیں کیا کیا ملا ہے۔! اس رات اس نے کھچڑی بنائی سب نے سیر ہوکر کھایا۔ بچوں کے آسودہ چہرے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"وہ کچن میں گئی تو رمضان پیکیج کا تھیلا کہیں دکھائی نہ دیا۔ وہ پریشان ہوگئی۔ بچوں سے پوچھا تو انھوں نے لاعلمی ظاہر کی۔ اسی اثناء میں روزہ کھولنے کا اعلان ہوگیا۔ منتشر ذہن ودل کے ساتھ اس نے افطار کیا۔ مغرب پڑھ کر اٹھی ہی تھی کہ آہٹ پر چونک گئی۔ لڑکھڑاتے قدموں سے گھر میں داخل ہوتے ہوئے انورکو دیکھ کر اس کا دل دھڑک اٹھا۔ رمضان پیکیج کی گمشدگی کی وجہ وہ جان گئی تھی۔ غم وغصے سے اس کی حالت غیر ہونے لگی۔"

پھر یہی معمول بن گیا۔ دو چار دن بعد کسی تنظیم کی طرف سے راشن کٹ تقسیم کی جاتی جو وہ اپنا نام لکھوا کر قطار میں کھڑی ہوکر لے آتی یا کوئی گھر تک پہنچادیا کرتا۔

دن بھر وہ بھوک مٹانے کی تگ ودو میں لگی رہتی۔ ان بے مہر حالات میں اسے تب خوشگوار احساس ہوتا جب ہمیشہ لڑائی جھگڑے اور مار پیٹ پر آمادہ انور اس سے نرم لہجے میں بات کرتا، اسے ہنستا، مسکراتا بچوں کے ساتھ کھیلتا دیکھ کر اس کے رگ وپے میں اطمینان کی لہر دوڑ جاتی، رات کا آنچل لہراتا تو انور کی بانہوں میں وہ دن بھر کی ساری کلفتیں بھول جاتی۔ شادی ہوئے دس سال گزر چکے تھے۔ تین بچوں کی ماں تھی مگر قربت کے ان لمحات میں اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی اس کا بیاہ ہوا ہو! اور وہ نئی نویلی دلہن ہو۔! وہ تو ہر رات شراب کے نشے میں انور کی وحشتوں کو سہنے کی عادی ہوچکی تھی۔!

ان لمحات میں وہ خودغرض ہوجاتی اور دعا کرتی کہ "لاک ڈاؤن کبھی ختم نہ ہو!"

ماہ رمضان المبارک کا آغاز ہوچکا تھا۔ ممتاز پابندی سے روزے رکھا کرتی تھی۔ اس بار گڈی بھی ضد کرکے روزے رکھ رہی تھی۔ لاک ڈاؤن میں توسیع کردی گئی تھی۔ امدادی تنظیموں کے علاوہ بھی اب لوگ فراخدلی سے راشن کٹس گھر گھر پہنچا رہے تھے۔ اس روز بھی اسے ایک رمضان پیکیج ملا تھا۔ وہ بہت خوش تھی کہ اب کچھ دنوں تک روزے کے دوران کڑی دھوپ میں قطاروں میں کھڑے رہنے سے نجات مل گئی تھی۔

دسواں روزہ تھا۔ عصر کے بعد وہ افطاری لانے کی غرض سے بازار گئی۔ پڑوس کی رقیہ بھابی بھی اس کے ساتھ تھیں۔ انھیں دوسری اشیاء بھی خریدنی تھیں۔ اسی وجہ سے گھر لوٹنے میں کچھ دیر ہوگئی۔ گھر پہنچی تو انور گھر میں نہ تھا۔ اس نے سوچا حسب معمول دوسری گلی میں اپنے دوستوں سے ملنے گیا ہوگا۔ افطار کا وقت قریب تھا۔ وہ کچن میں گئی تو رمضان پیکیج کا تھیلا کہیں دکھائی نہ دیا۔ وہ پریشان ہوگئی۔ بچوں سے پوچھا تو انھوں نے لاعلمی ظاہر کی۔ اسی اثناء میں روزہ کھولنے کا اعلان ہوگیا۔ منتشر ذہن ودل کے ساتھ اس نے افطار کیا۔ مغرب پڑھ کر اٹھی ہی تھی کہ آہٹ پر چونک گئی۔ لڑکھڑاتے قدموں سے گھر میں داخل ہوتے ہوئے انور کو دیکھ کر اس کا دل دھڑک اٹھا۔ رمضان پیکیج کی گمشدگی کی وجہ وہ جان گئی تھی۔ غم وغصے سے اس کی حالت غیر ہونے لگی۔

"انور، انور یہ کیا کیا تم نے؟ اس منحوس لت نے تمھیں اتنا خودغرض بنادیا کہ اس زہر کے لیے تم نے اپنے بیوی، بچوں کے منھ کا نوالہ چھین لیا۔! اب ہمارے پیٹ کی آگ کیسے بجھے گی؟ اب کیا کھائیں گے ہم لوگ؟"

"اری ہٹ۔ بدذات کہیں کی۔! بڑی آئی میری جاسوسی کرنے والی۔ زیادہ بک بک نہ کر۔ ورنہ میرا نشہ اتر جائے گا۔ حلق سوکھ کر کانٹا ہوگیا تھا۔ ترس گیا تھا شراب کے لیے۔ وہ تو شکر ہے کہ سرکار نے شراب بندی سے پابندی ہٹالی ورنہ میں تو تڑپ تڑپ کر مرجاتا۔!"

اس نے زور سے ممتاز کو دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑائی اور سر دروازے کی چوکھٹ سے جاٹکرایا اور خون کی دھار پھوٹ پڑی۔ تینوں بچے زور زور سے رونے لگے اور انور بے سدھ ہوکر چارپائی پر ڈھہ گیا۔

□□□

Rukhsana Nazneen
H. No. 4-2-22
Noor Khan Taleem
Bedar-585401(Karnataka)

طلعت جہاں سروہا

حقیقت کا آئینہ

صالح ایک افسانہ نگار تھا۔ ہر افسانہ نگار کی طرح اسے بھی کوئی ایسا کردار چاہیے تھا جو حقیقت اور سچائی پر مبنی ہو۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ اپنی تخلیقات سے سماج اور معاشرے کی برائیاں ختم کرے اور دل کے سارا گرد وغبار کا رنگ افسانوں میں بھر دے۔ اس کے افسانوں میں نئے کردار اور نئی روشنی کی جھلک نظر آتی تھی۔ ان سے قارئین کو نئی راہ ملتی۔ صالح نے کاغذ اور قلم اٹھایا اور ابھی لکھنا شروع ہی کیا تھا کہ پڑوس سے ایک عورت کی چیخنے چلانے کی آواز آنے لگی۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کا پڑوسی شراب کے نشے میں لاتوں اور گھونسوں سے اپنی پتنی کا برا حال کر رہا ہوگا۔ ان کے جھگڑوں سے سب ہی تنگ تھے۔ شور شرابے کی وجہ سے صالح کا قلم وہیں رک گیا اور وہ آواز کی طرف دوڑا۔

پڑوسی عورت شانتی زور زور چلا رہی تھی۔ لوگوں کا ایک ہجوم جمع تھا۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ انھیں یہاں سے نکالوں کیونکہ ان سے سب پڑوسی پریشان ہیں۔ کچھ لوگ انھیں گالی دے رہے تھے، برا بھلا کہہ رہے تھے۔ ایک پڑوسی نے ساونت پر کئی بالٹی پانی کی ڈال دی تو اس کو ہوش آنے لگا؟ پڑوس کے سب لوگ وہیں جمع ہو گئے تھے کہ آج اس بات کا فیصلہ کر کے ہی جائیں گے۔ سب کی ہمدردیاں شانتی کے ساتھ تھیں کہ بیچاری آخر عورت ہی تو ہے..... کب تک ظلم برداشت کرے گی..... روزانہ یہ ڈرامہ بازی اور مار پیٹ..... ساری گلی والوں کو بدنام کر کے رکھ دیا؟

شانتی شروع میں تو چپ چاپ سہمی ہوئی بیٹھی رہی تھی مگر پڑوسیوں کے آنے سے اس کا حوصلہ بڑھا۔ بیٹھ کر بچے کو دودھ پلانے لگی..... مگر دو دن کی بھوکی..... کہاں چھاتیوں میں سے دودھ اترتا..... لیکن لگتا ہے بچہ بھی ڈرے سے خموش ہو گیا تھا..... اور شاید اسے ماں کی آغوش میں کچھ سکون ملا ہو۔

شانتی سارا دن گلیوں میں سے کباڑ چن کر ایک بورے میں اکٹھا کرتی اور پھر کباڑی کی دکان پر بیچ آتی۔ وہ خود ہی گھر کا خرچ چلا رہی تھی۔ آج پھر اس کا پتی شراب کے لیے روپے مانگ رہا تھا۔ اس نے منع کر دیا کہ بڑی بیٹی کو بخار تیز ہے۔ پہلے اس کو ڈاکٹر کو دکھا کر دوا لاؤ..... بس اسی بات پر ساونت نے مار پیٹ شروع کر دی اور ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ سارے پڑوس والے عادی ہو چکے تھے..... مگر آج بگڑ گئے۔

جب ساونت کو ہوش آیا تو اسے شرمندگی ہونے لگی۔ پڑوسیوں کا ہجوم اور ان کے آج کے تیور نے اس کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ مار پیٹ کا یہ ڈرامہ تو ہوتا ہی رہتا تھا مگر آج تو خود اس نے حد کر دی تھی۔ شانتی کے بدن پر چوٹ کے نشان اور زخم صاف دکھائی دے رہے تھے اور وہ درد و اذیت میں مبتلا تھی۔ آہ و کرب کا منظر تھا۔ سانس بھی کھینچ کھینچ کر آ رہی تھی اور وہ بری طرح کراہ رہی تھی۔ ایسے میں بچہ بھی چھاتیوں سے لپٹا ہوا تھا۔ کسی نے کہا کہ ساونت کو پولیس کے حوالے کر دو۔ کسی نے کہا کہ سرپنچ کو بلاؤ اس کا فیصلہ آج ضرور ہونا چاہیے۔ کچھ لوگوں نے کچھ اور صلاح و مشورہ پیش کیے۔

آخر اس بیچاری کا کیا قصور ہے۔ دن بھر گلی گلی پھرتی ہے تب جا کے کہیں روٹی سبزی کا انتظام کر پاتی ہے۔ یہاں تک کہ کبھی اپنے مائکے والوں کو بھی کوئی خبر نہیں دیتی کہ میرے ساتھ میرا پتی کیسا سلوک کرتا ہے۔ یہاں تک پڑوسیوں کو ہاتھ جوڑ کر منع کرتی کہ میرے مائکے والوں کو کبھی خبر مت کرنا ورنہ وہ برداشت نہ کر سکیں گے۔ کہتی تھی کہ میں نہیں چاہتی میرے مائکے والے میری پتی کی بے عزتی کریں۔ لیکن آج تو سبھی پڑوسیوں نے ایک جٹ ہو کر یہ فیصلہ کر ہی لیا تھا کہ اس کو سبق سکھا کر رہیں گے..... ایک ناری کے ساتھ اتنا بڑا انیائے۔

سرپنچ بھی آ گئے تھے۔ سرپنچ نے ساری باتیں دھیان سے سنیں اور کہا کہ رات ہو چکی ہے۔ صبح نو بجے سب کو آنا ہے۔ جو آپ فیصلہ دیں گے وہی منظور ہوگا۔ ساونت نیچی نگاہ کیے ایک مجرم کی طرح بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ بہت شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ اسے اپنے کیے پر پچھتاوا ہو رہا تھا۔ اس کا دل پریشان تھا..... اب سے پہلے وہ اتنا کبھی گھبرایا بھی نہیں تھا..... جنوری کے مہینے میں بھی اسے پسینہ آ رہا تھا جو صاف جھلک رہا تھا۔

صالح یہ پورا واقعہ دیکھتا رہا پھر اپنے گھر کو لوٹ آیا کہ آج تو ضرور اس کہانی کے کردار کو لکھ کر ایک نیا پیغام دوں گا۔ وہ خوش تھا چلو کچھ تو ملا۔ اس کو افسانے کا رنگ دوں گا جو حقیقت کی طرح کڑوی دوا نظر آئے گی۔ اس نے قلم اٹھایا اور افسانے میں رنگ بھرنے لگا۔ اس کا سنسان کمرہ اور قلم..... وہ چپ چاپ اپنا قلم چلاتا رہا..... آج اسے خود بھی پسینہ آ رہا تھا۔

صبح ہونے پر لوگ ناشتہ سے فارغ ہو کر اکا دکا پنچایت میں آ کر بیٹھنے لگے۔ نو بجے تک لوگوں کا ایک ہجوم جمع ہو گیا۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ذرا دیر ہی گزری تھی کہ سرپنچ بھی آ گئے۔ کئی لوگوں سے ہاتھ ملایا اور بیٹھ گئے۔ ساونت کو بلایا اور پوری تفصیل پوچھی۔ وہ ہکلا ہکلا کر بولتا رہا..... لوگ سنتے رہے..... پنچایت کے ایک ممبر نے کہا کہ ساونت! بھئی یہ روز روز کا کیا تماشہ ہے..... اس بدتمیزی کی وجہ سے..... تمھارے اس ڈرامہ کی وجہ سے سبھی لوگ تنگ ہیں۔ آخر تمھارے گھر میں بھی تو بیٹیاں ہیں؟ اگ ران کے ساتھ بھی شادی کے بعد یہی کچھ ہوا تو تم کیا کرو گے؟؟ تمھارا ساتھ کوئی نہیں دے گا۔ تمھاری ان بدتمیزیوں کی وجہ سے لوگوں نے ان کے ساتھ بھی بولنا بہت کم کر دیا ہے؟ آخر خطا تم کرو سزا اور بھگتیں۔

ساونت ساری باتیں سن رہا تھا..... رات ہی سارا نشہ دور ہو چکا تھا۔ نظر نیچی کیے بیٹھا تھا..... ادھر ادھر نظر اٹھانے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ وہ ہمت ہی نہیں کر پا رہا تھا۔

افسانہ نگار صالح کا نیا افسانہ مکمل انجام تک پہنچا تو ہی رات دو بجے اسے نیند آئی تھی۔ صبح دیر سے اٹھا۔ وہ ابھی ہاتھ منھ ہاتھ دھو رہا تھا کہ بلاوا آ گیا کہ صالح صاحب! آپ کو سرپنچ نے بلایا ہے۔ جلدی سے اس نے چائے کا ایک کپ زبردستی پی ہی لیا اور پنچایت کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا جا پہنچا۔ سبھی نے اس کا سواگت کیا۔ اس وقت تک ساری باتیں ہو چکی تھیں۔ سرپنچ نے ساری باتیں دہرا کر سب سے مشورے مانگے۔ سرپنچ نے کہا کہ صالح صاحب آپ کی کیا رائے ہے۔

صالح نے کہا، ''میرے بزرگوں اور پیارے ساتھیوں! آپ کا جو مشورہ ہوا ہے اور آپ جو فیصلہ کرنے والے ہیں وہی قابل قبول ہوگا۔ ساونت میرا کلاس فیلو رہا ہے۔ میں نے کبھی اس میں کوئی برائی نہیں دیکھی۔ وہ باشعور تھا..... ڈگری ملنے کے بعد بھی اسے کوئی سرورس نہ مل سکی، پاؤں کی چپل گھس گئی تھی مگر بغیر رشوت کے کہاں جاب ملتی؟ اسی غم میں شراب کا عادی بنا دیا۔ کئی بار میں نے اس کی مدد بھی کی ہے۔ آپ معلوم کر سکتے ہیں؟ اب سرپنچ جی آپ بتائیے کیا فیصلہ کرنا ہے؟ یا تو اسے سزا دیں یا اس کی مدد کریں۔ سزا دیں گے تو اور بگڑتا جائے گا۔ فطری طور پر یہ اچھا ہے۔ حالات کی وجہ سے ایسا بنا ہے۔ چلیے ہم سب اس کی مدد کر کے دیکھتے ہیں۔ اس سے پہلے آپ نے سبھی لوگوں کی باتیں سنیں..... کچھ نے اسے سزا دینے کی بات کی..... کچھ نے کہا ہے کہ جیسے بھی ہو اس کی مدد کی جائے جو ہم سب کا فرض ہے۔ یہ کوئی سیاسی فیصلہ نہیں انسانیت کا تقاضہ ہے اور وقت کی پکار ہے۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہی بہت ہے؟ اس ک و پنچایت کی طرف سے ای۔ رکشہ خرید کر دی جائے اور کچھ کھانے کا سامان بھی۔ میں شروعات کر رہا ہوں۔ سرپنچ جی میں اسے گیارہ ہزار روپے دے رہا ہوں..... آپ بھی ہاتھ بڑھائیں..... سب ہاتھ بڑھائیں۔ سرپنچ جی نے اکتیس ہزار روپے گن کر دیے۔

سبھی لوگوں نے بھرپور مدد کی اور کان پڑی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ صالح نے کہا کہ آپ سب لوگ اب آرام سے بیٹھ جائیے۔ آخر روپے گنے گئے تو سوا دو لاکھ روپے ہو گئے۔ سرپنچ نے یہ ذمہ داری دو اعتماد لوگوں کو دی کہ کل ہی اس کو ای۔ رکشہ لا کر دو اور کھانے کا سامان بھی۔ ساونت یہ ماجرا دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور صالح کی گود میں سر رکھ کر رونے لگا۔ سبھی لوگ غمزدہ ہو گئے۔

کچھ دنوں بعد صالح کو جاب ملی اور وہ فیملی کے ساتھ دبئی چلا گیا۔ وہاں ایک کمپنی میں منیجر کی حیثیت سے کام میں جٹ گیا۔ برسوں گزر گئے۔ اس کے بالوں میں سفیدی آ گئی۔ وہ دبئی کا ہی ہو کر رہ گیا تھا۔ مالک اس کی

ایمانداری سے بہت خوش تھے۔

پندرہ سال کے بعد آج وہ اپنے وطن عزیز لوٹ رہا تھا۔ پندرہ سال میں تو گاؤں کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ صالح نے دیکھا کہ گاؤں جانے والی سڑک پختہ سڑک بن گئی تھی۔ وہ اپنا سامان بس سے اتارنے لگا کہ کئی رکشہ والے آ گئے۔ اس نے رکشہ والوں پر دھیان نہیں دیا بس چاروں طرف نئی نئی باتیں دیکھ رہا تھا اور خوش ہو رہا تھا۔ اتنے میں اس کے کانوں میں مانوس آواز پہنچی۔ چونک کر دیکھا تو رکشہ والوں میں ساونت بھی تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں تو ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے اور پھر ایک دوسرے کے گلے سے لپٹ گئے۔

ساونت نے سارا سامان اٹھایا اور رکشہ میں رکھ کر گاؤں کی طرف چل دیا۔ باتوں باتوں میں صالح نے پوچھا کہ تمھارے لڑکے کیا کر رہے ہیں؟

''صالح! بھئی ایک تو پرائمری اسکول میں سرکاری ٹیچر ہے۔ دوسرا ڈاکٹری کورس کر رہا ہے۔ دونوں بیٹوں کی شادی کر چکا ہوں۔ گاؤں والوں نے میری بہت مدد کی۔ صالح! بھئی تمھارا کیسے شکریہ ادا کروں۔ میرے پاس الفاظ ہی نہیں ہیں۔ میں تو اسی روز قسم کھا چکا تھا کہ اب کبھی شراب نہیں پیوں گا؟ اب بھگوان کی کرپا ہے۔ گاؤں کے لوگ بہت اچھے ہیں۔ کوئی بھید بھاؤ نہیں..... سب کے اچھے سنسکار ہیں۔ لو! تمھاری منزل آ گئی۔

ساونت نے سارا سامان اتار کر اس کے مکان تک پہنچا دیا؟

کردار اپنا پہلے بناؤ تو بات بنے
پھر آئینہ جہاں کو دکھاؤ تو بات بنے

Talat Jahan Saroha
12/944 Daud Sarai
Saharanpur-247001(U.P)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر..... .....بتاریخ.....

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے IFSC: SYNB0009009، A/C: 90092010045326 میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : .....

پتہ : .....

.....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

مردلا گھئی

احساس

درد کے سمندر میں
دم توڑتی جینے کی چاہت
انتر دوند کی راکھ میں
بجھتی سی پیار کی چنگاریاں
پت جھڑ کی آندھی میں اوجھل ہوتے
ساون کے جھولیں
ان جانی گلیوں میں راہ ڈھونڈھتی
پیار کی خواہش
تکرار کی آگ میں جھلستی
ساتھ کی چاہ
بند دروازوں میں سسکیاں
لیتی اندر دھنشی تمنائیں
پتھراتے جذبات میں دبے
گدگداتے احساس

چہرے کی لکیروں میں الجھے
دل چھوتے اسپرش
ساکشی ہے،
مسکراہٹوں کی موجوں پر سوار
جینے کی چاہت سے پریرت
پیار کے ساون کو اوڑھ
من چاہے ساتھ کی گرماہٹ لیے
اندر دھنشی تمناؤں میں سرابور
اپنے سے ساتھ کو کھوجتی
ایک ادھ کھلی کلی کی لڑکھڑاہٹ

Ms. Mridula Ghai
B-378
Nirman Vihar
Vikas Marg
Delhi-110092
E-mail: mirul3@rediffmail.com

غزلیں

سیدہ تبسم منظور ناڈکر

عشق کے دریا میں اک بار اتر جانے دے
درد کی لہروں سے مجھ کو بھی گزر جانے دے

لمس پاکر ترا مجھ کو تو سنور جانے دے
تیری باہوں میں مجھے آج بکھر جانے دے

اک نئی لہر کی مانند ملوں گی آکر
ناؤ کاغذ کی کنارے پہ ٹھہر جانے دے

میں تصور ہی کی دنیا میں رہا کرتی ہوں
اِس تخیل کو مرے ساتھ ہی مر جانے دے

بس ہتھیلی پہ ترا نام لکھا ہے میں نے
تیرے ہی رنگ میں اب مجھ کو نکھر جانے دے

شب کی تنہائی مجھے آج ستاتی ہے بہت
اپنے خوابوں کے جزیروں سے گزر جانے دے

اپنے دامن پہ سجاتی ہے تبسم کلیاں
تپتے صحراؤں سے اب اس کو گزر جانے دے

آکے اک دن مری دنیا کو سجا جاؤ کبھی
مجھ میں خوابوں کے چمن زار کھلا جاؤ کبھی

اب سبب پوچھتے ہیں سب مری بربادی کا
تم ہی آجاؤ زمانے کو بتا جاؤ کبھی

چاند میں ڈھونڈتی رہتی ہوں تمھیں کو ہر شب
مجھ کو اپنا رخ پُر نور دکھا جاؤ کبھی

میں نے دیکھا نہیں اب تک کبھی عید کا چاند
تم مثال مہ نو بام پہ آ جاؤ کبھی

بزم عشرت میں مرا دل نہیں لگتا تم بن
محفلیں میری ذرا آکے سجا جاؤ کبھی

دوڑنے پھرنے لگی جان بدن میں میرے
خون بن کر میری رگ رگ میں سما جاؤ کبھی

غنچۂ لب پہ مرے تاکہ تبسم مہکے
تم صبا بن کے مرے باغ میں آجاؤ کبھی

Syeda Tabassum Manzoor Nadkar
226/1807, Road No 6
Motilal Nagar No 1, Goregaon west
Mumbai 400104

شاور ما بنانے کی ترکیب

اجزا: چکن 750 گرام، دہی ایک کپ، سرکہ ایک چوتھائی کپ، لہسن 2 جوئے، کالی مرچ 1 چائے کا چمچ، نمک 1 چائے کا چمچ، ہری الائچی 2 عدد۔

لیموں کا رس سوس بنانے کے لیے: تل کا پیسٹ 1 کپ، لہسن 2 جوئے، لیموں کا رس ایک چوتھائی کپ

دہی 4 چار کھانے کے چمچ، پیٹا بریڈ 4 عدد، باریک کٹا کھیرا حسبِ ضرورت، کٹی پیاز حسب ضرورت، ساک 1 چائے کا چمچ، ٹماٹر حسبِ ضرورت

لال مرچ پیسٹ کے لیے: کشمیری مرچ 6 عدد، زیرہ 1 چائے کا چمچ

تیار کرنے کی ترکیب: کشمیری مرچ، زیرہ لے کر اس کو پانی میں بھگو لیں۔ اس کے بعد بلینڈر میں بلینڈ کر لیں۔ مرچ پیسٹ تیار ہے۔

چکن میں تمام مصالحہ کو ملا لیں اور پھر گرل کر لیں۔ پکنے کے بعد چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ لیں اور سوس میں ملا لیں۔

اب پیٹا بریڈ پر چلی پیسٹ لگا لیں اور چکن کے ٹکڑے میں زیتون کا تیل ڈالیں اور اس کو رول کر لیں۔ گھر کا مزیدار شاور ما تیار ہے۔ کھانے کے لیے سرو کریں۔

فرائیڈ پرانز بنانے کی ترکیب

اجزا: چھوٹے جھینگے 200 گرام، رائس نوڈلز ایک پیکٹ (200 گرام)، نمک حسب ذائقہ، لہسن کے جوئے چھ سے آٹھ عدد، پیاز

ایک عدد، کوکونٹ ملک ایک پیالی، ٹماٹر تین سے چار عدد، پسی ہوئی لال مرچ ایک چائے کا چمچ، ہلدی ایک چائے کا چمچ، ثابت لال مرچیں تین سے چار عدد، کوکنگ آئل حسب ضرورت

تیار کرنے کی ترکیب

جھینگوں کو دھو کر ان کے چھوٹے ٹکڑے کرلیں، پھر دو سے تین جوئے لہسن اور ثابت لال مرچوں کے ساتھ انہیں اوون میں (100C پر) یا توے پر ہلکی آنچ پر اتنی دیر سینکیں کہ خشک اور خستہ ہو جائیں۔ تین سے چار کھانے کے چمچ کوکنگ آئل میں باریک کٹی ہوئی پیاز کو سنہری فرائی کریں اور آدھی پیاز کو جھینگوں میں نمک کے ساتھ ملا دیں۔

بقیہ پیاز میں نمک، پسی لال مرچ، ہلدی اور موٹے کٹے ٹماٹر ڈال کر ہلکی آنچ پر ڈھک دیں۔

ٹماٹر گلنے پر آجائے تو تیل علیحدہ ہونے تک بھون لیں۔ اس میں کوکونٹ ملک شامل کر کے ہلکی آنچ پر پانچ سے سات منٹ دم پر رکھ کر اتار لیں۔

نوڈلز کو نمک ملے ابلتے ہوئے پانی میں دس سے پندرہ منٹ بھگو کر رکھیں پھر چھلنی میں رکھ کر خشک کریں اور کوکنگ آئل میں سنہری فرائی کرلیں۔

کیسر (زعفران) پستہ لسی بنانے کی ترکیب

اجزا: چند تاریں زعفران (کیسر)، ایک کھانے کا چمچ پستہ کٹا ہوا، ایک کپ تازہ دہی جو مکمل چکنائی کے حامل دودھ سے تیار کردہ ہو، ایک کپ مکمل چکنائی کا حامل دودھ، 8 چائے کے چمچ پسی ہوئی چینی، 4 تا 5 برف کے کیوبز (Cubes)

تیار کرنے کی ترکیب: دھیمی آنچ پر ایک نان اسٹک پین گرم کریں۔ اس میں زعفران (کیسر) کی تاریں شامل کریں اور تقریباً 10 سیکنڈ تک خشک روسٹ کریں۔

اس میں 2 کھانے کے چمچ دودھ شامل کریں اور آہستگی اور نرمی کے ساتھ مکس کریں اور تقریباً 15 منٹ تک کے لیے ایک جانب رکھ دیں۔

ماسوائے برف کے کیوبز تمام اجزائے ترکیبی باہم یکجا کریں۔ انھیں 3 تا 4 منٹ تک ایک مکسر میں بلینڈ کریں۔

4 انفرادی گلاسوں میں انڈیل دیں۔ فی الفور نوش کرنے کے لیے پیش کریں۔

ڈرم اسٹک پکوڑا بنانے کی ترکیب

اجزا: ڈرم اسٹک (اُبال لیں) 4-6 عدد، بیسن آدھا کپ، کارن فلور آدھا کپ، کالی مرچ پاؤڈر ایک چوتھائی چائے کا چمچہ، نمک حسب ذائقہ، ہلدی پاؤڈر ایک چوتھائی چائے کا چمچہ، زیرہ پاؤڈر آدھا چائے کا چمچہ، مسٹرڈ پاؤڈر آدھا چائے کا چمچہ تیل فرائی کرنے کے لیے، خشک بیسن حسب ضرورت

تیار کرنے کی ترکیب: پیالے میں بیسن، کارن فلور، کالی مرچ پاؤڈر، نمک، ہلدی پاؤڈر، زیرہ پاؤڈر اور مسٹرڈ پاؤڈر ڈال کر حسب ضرورت پانی سے گاڑھا پیسٹ تیار کرلیں۔

2 ڈرم اسٹک کو پہلے خشک بیسن سے کوٹ کریں۔ پھر پیسٹ میں ڈیپ کرلیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کر کے ڈرم اسٹک ڈال کر فرائی کریں۔ سنہری ہو جائے تو سرونگ ڈش میں نکال کر کیچپ کے ساتھ سرو کریں۔

(بحوالہ: www.urdupoint.com)

□□□

ڈاکٹر محمد صفوان قدوائی

دوران حمل ذیابیطس شکری

(Gestational Diabetes Mellitus)

عصر حاضر میں ذیابیطس کا مرض بہت عام ہوتا جارہا ہے، ذیابیطس کے مریضوں کی تعداد روز بہ روز بڑھتی جارہی ہے۔ طرز زندگی (Lifestyle) میں بدلاؤ کی وجہ سے ذیابیطس کے مریضوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ ذیابیطس میں خون میں شکر کی مقدار طبعی سے زیادہ ہوجاتی ہے۔ ذیابیطس شکری (Diabetes Mellitus) کی عام طور پر تین قسمیں ہوتی ہیں۔ پہلی قسم کو Type 1 Diabetes Mellitus، دوسری قسم کو Type 2 Diabetes Mellitus اور تیسری قسم کو Gestational Diabetes Mellitus کہتے ہیں۔ عام طور پر اسے ۱۴ فیصد حاملہ خواتین (Pregnant women) میں ذیابیطس دیکھنے کو ملتی ہے، اس میں خاص طور سے 90 فیصد دوران حمل ذیابیطس (Gestational Diabetes Mellitus) ہوتی ہے۔ دوران حمل ذیابیطس شکری کی 50 فیصد مریضہ کو مستقبل میں Type 2 Diabetes کا مرض ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔

تعریف (Definition)

بعض خواتین کو حمل کے دوران خصوصاً دوسرے سہ ماہی (Second Trimester) کے آخر یا تیسرے سہ ماہی (Third Trimester) دور میں ذیابیطس ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض وضع حمل (Labour) کے بعد طبعی حالت پر آجاتی ہیں، اس لیے اسے Gestational Diabetes کہا جاتا ہے، اس کو Pregnancy Induced Glucose intolerance بھی کہتے ہیں۔ ایسا دیکھا گیا ہے کہ دوران حمل ذیابیطس کی مریضہ میں پہلے ہی سے بیٹا خلیات (Beta cells) میں نقص ہوتا ہے، لیکن اس کی تشخیص نہیں ہو پاتی ہے۔ یہ مریض بنیادی طور سے Pre existing Type 2 Diabetes کے مریض ہوتے ہیں۔

محرکاتی عوامل (Predisposing factors)

دوران حمل ذیابیطس شکری ہونے کے امکانات کچھ صورتوں میں زیادہ ہوتے ہیں، ان صورتوں کو دوران حمل ذیابیطس کے محرکاتی عوامل کہتے ہیں، جو کہ درج ذیل ہیں۔

1۔ جن خواتین کے خاندان (Family) میں ذیابیطس کی روداد (History) موجود ہو مثلاً والدین، بھائی بہن، چچا چچی میں ذیابیطس کی روداد موجود ہو۔

2۔ ایسی حاملہ خاتون جن کے بچہ کا وزن پیدائش کے وقت ۴ کلو یا اس سے زیادہ ہو۔

3۔ خواتین کا وزن طبعی سے زیادہ ہو یعنی موٹاپا (Obesity) کا پایا جانا۔

4۔ ایسی خواتین جن کی عمر 30 سال سے زیادہ ہو۔

5۔ ایسی خواتین جن کے پیشاب میں مستقل طور سے شوگر کی مقدار طبعی سے زیادہ رہتی ہو۔

تشخیص (Diagnosis)

دوران حمل ذیابیطس کی تشخیص اسکریننگ کے ذریعہ کی جاسکتی ہے۔American college of Obstetricians and Gynaecologists کے مطابق ہر حاملہ عورت کو جبکہ کچھ ماہرین کے مطابق ایسی حاملہ خواتین جن میں محرکاتی عوامل موجود ہوں، ان کو حمل کے 24/اور 28 ہفتے کے درمیان ۵۰ گرام گلوکوز کھلا کر کے ار گھنٹہ کے بعد بلڈ گلوکوز کی جانچ کرانے کی صلاح دیتے ہیں، اگر اس جانچ میں خون میں شکر کی مقدار140 mg/dl یا اس سے زیادہ آئے تو100 gm Oral Glucose test کرایا جاتا ہے۔اس ٹسٹ میں صبح نہار منہ حاملہ خاتون کو 100 gm گلوکوز کھلایا جاتا ہے اس کے بعد خون میں شوگر کی مقدار 1، 2اور 3 گھنٹہ پر ناپی جاتی ہے۔اگر اس جانچ میں نہار منہ بلڈ گلوکوز 95 mg/dl یا اس سے زیادہ ہو، پہلے گھنٹہ پر بلڈ گلوکوز 180 mg/dl یا اس سے زیادہ آئے، دوسرے گھنٹہ پر بلڈ گلوکوز 155 mg/dl یا اس سے زیادہ آئے تو دوران حمل ذیابیطس شکری کی یقینی تشخیص (Confirm diagnosis) ہوجاتی ہے۔

دوارن حمل ذیابیطس کے خطرات (Hazards of Gestational Diabetes Mellitus)

دوران حمل ذیابیطس کے ماں اور ہونے والے بچہ پر درجہ ذیل اثرات ہوسکتے ہیں۔

☆ بڑے جنین (Foetus) کی وجہ سے Amniotic fluid کی مقدار طبعی سے زیادہ ہوجاتی ہے جس کو طبی اصطلاح میں Polyhydramnios کہتے ہیں۔اس کی وجہ سے وضع حمل (Labour) میں پیچیدگیاں ہوسکتی ہیں۔

☆ مستقبل میں ہونے والی حمل (Pregnancy) میں دوران حمل ذیابیطس کے ۵۰ فیصد امکانات ہوتے ہیں۔

☆ دوران حمل ذیابیطس سے متاثرہ ماں سے پیدا ہونے والے بچہ میں بھی مستقبل میں Type 2 Diabetes کے ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔

☆ پیدا ہونے والے بچہ کا جسم (body) طبعی سے زیادہ بڑا ہوسکتا ہے، جس کو طبی اصطلاح میں Macrosomia کہتے ہیں۔

☆ پیدائش کے بعد بچہ کے کندھے (Shoulder) پر غیر طبعی طور سے شحم (Fat) کا اجتماع ہوسکتا ہے، جس کی وجہ سے ولادت میں دشواری ہوتی ہے اس کو طبی اصطلاح میں Shoulder Dystocia کہتے ہیں۔

☆ ایسی خواتین جن میں نہار منہ کی بلڈ گلوکوز طبعی سے زیادہ (Fasting hyperglycemia) رہتی ہوان میں مستقبل میں ذیابیطس کے ہونے کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے، اس کے علاوہ امراض قلب ہونے کے امکانات بھی زیادہ ہوتے ہیں۔

علاج (Management)

☆ طبعی وزن (Normal weight) والی خواتین کو 2000-2500 کیلوریز ہر دن دی جائے جبکہ ایسی خواتین جن کا وزن طبعی

سے زیادہ ہوان کو1800-1200 کیلوریز ہر روز دی جائے۔ مریضہ کو Complex Carbodydrate دی جائے مثلاً دلیا، چنا، جو، ستو وغیرہ کیونکہ ان کے استعمال سے خون میں شکر کی مقدار زیادہ نہیں بڑھتی ہے۔ اس کے علاوہ میٹھی اور چکنی غذاؤں سے پرہیز کرایا جائے۔

☆ مریضہ کو Glucomoter کے ذریعہ خود اپنی بلڈ شوگر چیک کرتے رہنا چاہیے، ایسی خواتین جن کا بلڈ گلوکوز طبعی رہتا ہے ان میں خطرات کے امکانات بھی کم ہوتے ہیں۔ ایسی خواتین کا Fasting blood glucose 90 mg% سے کم ہونا چاہیے۔ اگر خون میں شوگر طبعی سے زیادہ ہو جائے تو اسے غذائی پرہیز یا انسولین سے کنٹرول کرنا چاہیے۔ اگر Fasting blood glucose level 90 mg/dl سے زیادہ ہو اور کھانے کے بعد کی بلڈ گلوکوز120 mg/dL سے یادہ ہو تو ماہر طبیب سے رجوع کر کے انسانی انسولین (Human Insulin) استعمال کرنا چاہیے۔ عام طور پر ۲۵ ر فیصد دوران حمل ذیابیطس کی مریضہ کو انسولین کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہلکا تیز چلنا (Brisk walking) حمل میں مفید اور محفوظ ہے، اس سے Insulin کی ضرورت بھی کم ہو سکتی ہے۔

قبالتی علاج (Obstetric Management)

ایسی خواتین جن کی شوگر کنٹرول میں رہے، جن کو انسولین کی ضرورت نہ پڑے، ان میں Normal delivery ہو سکتی ہے۔ جبکہ ایسی خواتین جن میں انسولین چل رہی ہو اور ان میں عوارضات (Complications) بھی موجود ہوں تو اس صورت میں Cesearian section یعنی آپریشن کے ذریعہ Delivery کرانا چاہیے۔

☆ موجودہ دور میں American Diabetes Association یہ صلاح دیتی ہے کہ ایسی خواتین جن میں دوران حمل ذیابیطس (Gestational Diabetes Mellitus) کی روداد موجود ہو ان کو زندگی بھر ہر تیسرے سال بلڈ شوگر کی جانچ کراتے رہنا چاہیے تاکہ صحیح وقت پر Type 2 Diabetes Mellitus کی تشخیص ہو سکے اور خواتین ذیابیطس کے عوارضات سے بچ سکیں۔

احتیاطی تدابیر (Precautions)

ساتویں ماہ کے بعد حاملہ کو ہر ہفتے ماہر امراض قابلہ سے معائنہ کرواتے رہنا چاہیے۔ درمیان میں کسی قسم کی غیر طبعی حال رونما ہونے پر فوری طور پر ماہر طبیب سے رجوع کرنا ضروری ہے۔

حوالہ جات (References)

1۔ ڈی سی دتا، ٹکسٹ بک آف آبسٹیٹرکس، آٹھواں ایڈیشن، جے پی بردرس، میڈیکل پبلشرز، نئی دہلی، 2015، صفحہ 327-326

2۔ اسٹیفن مک فی، کرینٹ میڈیکل ڈائگنوسس اینڈ ٹریٹمنٹ، 60واں ایڈیشن، مک گراں ہل، نیویارک، 2021، صفحہ 841-840

3۔ کیسپر ہاؤسر، ہیریسن پرنسپلس آف انٹرنل میڈیسن، ۲۰واں ایڈیشن، مک گراں ہل ایجوکیشن، 2018، صفحہ 2851

4۔ ڈاکٹر یوسف انصاری، کتاب قابلہ، ادارہ کتاب الشفاء، نئی دہلی، صفحہ 189-188

5۔ طیبہ عارفہ خاتون، دوران حمل ذیابیطس شکری، جہان طب ذچہ بچہ صحتی نگہداشت نمبر، اپریل۔ جون ۲۰۱۰ء، جلد ۱۱، شمارہ ۴، مرکزی کونسل برائے تحقیقات طب یونانی، نئی دہلی، صفحہ 151-149

6۔ ٹے برس سائکلو پیڈیک میڈیکل ڈکشنری، ۲۱ واں ایڈیشن، ایف۔ اے۔ ڈے وس، کمپنی، فلاڈیلفیا، 2005، صفحہ 1388

□□□

Dr. Mohd Safwan Kidwai

Village Turkani

Post Safdarganj

District Barabanki-225412 (Uttar Pradesh)

Mobile: 9005109892

حسن کی نگہداشت

ملتانی مٹی آئلی اسکن کے لیے فائدہ مند ہے

ملتانی مٹی اور پانی ملا کر پیسٹ بنالیں۔ اس پیسٹ کو چہرے پر لگا کر سوکھنے دیں۔ پوری طرح سوکھنے کے بعد پانی سے دھولیں۔

ملتانی مٹی اور آدھا چمچ لیموں کا رس یا سنترے کا رس ملا کر پیسٹ بنالیں۔ اس پیسٹ کو چہرے پر لگا کر سوکھنے دیں۔ پوری طرح سوکھنے کے بعد ٹھنڈے پانی سے چہرے کو دھولیں۔ یہ عمل بہت فائدہ پہنچاتا ہے۔

بالوں کے گرنے میں ہلدی فائدہ مند ہے

بالوں کو گرنے سے بچانے کے لیے ہلدی بہت مفید سمجھی جاتی ہے۔ بالوں کے جھڑنے کی وجہ ہاضمے سے محروم ہونا ہے، کیونکہ ہاضمہ خراب ہونے کی وجہ سے بالوں کی جڑوں کو مناسب تغذیہ نہیں ملتا ہے، جس

کی وجہ سے بالوں کا جھڑنا شروع ہوجاتا ہے۔ اس کے علاوہ، بلغم کے نقائص میں اضافے کی وجہ سے بھی بالوں کا گرنا دیکھا گیا ہے۔ اس معاملے میں ہلدی بہت فائدہ مند ہوتی ہے۔ یہ صحت مند ہاضمہ میں مدد کرتی ہے اور بالوں کو جھڑنے سے بچاتی ہے۔

گھر میں خشک جلد کی دیکھ بھال کے لیے شہد کا استعمال کیسے کریں

شہد خشک جلد کے لیے بہت فائدہ مند ہے۔ اگر بدلتے موسم کی وجہ سے جلد خشک ہوجائے تو، شہد کا استعمال کرنے سے جلد میں نمی آجاتی ہے۔ اسے دس منٹ تک چہرے پر رکھیں اور پھر چہرہ دھولیں۔

خشک جلد کے لیے ٹماٹر اور اورنج پیک بیوٹی ٹپس کا استعمال کیسے کریں

آدھے پپیتے کے گودا میں 1 ٹماٹر اور سنترے کا گودا اور 1-1

چائے کا چمچ گلاب جل اور گلیسرین ملالیں، اسے 20 منٹ تک چہرے پر چھوڑ دیں اور سوکھنے کے بعد چہرے کو دھولیں۔ اس سے جلد میں نمی رہتی ہے۔

پپیتے سے کریں غیر ضروری بالوں کا خاتمہ

پپیتا میں پاپین انزائم ہوتے ہیں، جو بالوں کو بڑھنے سے روکتے ہیں۔ اس کا استعمال آپ کے بالوں کی نشوونما کو کم کرتا ہے، اور وہ جلدی نہیں بڑھتے ہیں۔ حساس جلد کے لیے پپیتا بہت فائدہ مند ہے۔ اس کے استعمال سے، آپ اس مسئلے سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا حاصل کرسکتے ہیں۔ غیر ضروری بالوں کو ختم کرنے کا یہ ایک بہت ہی درست طریقہ ہے۔ اس کے لیے 2 عدد پپیتا اور آدھا چمچ ہلدی پاؤڈر لیں۔ پہلے پپیتا چھلکیں سمیت گرائنڈ کرلیں۔ اس پیسٹ میں ہلدی ڈال دیں۔ پیسٹ کو چہرے اور گردن میں اچھی طرح سے 15 منٹ تک لگائیں۔ کچھ دیر بعد، پانی سے دھولیں۔ اس پیسٹ کو ہفتے میں 2 بار استعمال کریں۔

(https//:www.1mg.com)

□□□

تاثرات: نگر نگر سے

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا ماہنامہ ''خواتین دنیا'' کونسل کے روشن مستقبل کا ضامن ہے۔ یہ رسالہ متنوع موضوعات پر مشتمل ایسا مکمل اور جامع رسالہ ہے جس میں خواتین کیا سبھی قارئین اپنے لیے کوئی نہ کوئی گراں قدر موضوعات پر نہایت پر مغز اور دلچسپ مقالات سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ یہ ادبی، علمی، خانگی زندگی کے مسائل، صحت، آرائش و زیبائش، کھیل غرض زندگی کے گوناگوں پہلو کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے رہتا ہے یہی سبب ہے کہ ہر ایک قاری خاص طور پر خواتین کو اس کی آمد کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ موضوعات کا تنوع قاری کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ اس ایک رسالے میں قاری کو اپنی دلچسپی کا تمام مواد آسانی سے دستیاب ہو جاتا ہے۔

اکتوبر 2019 کا شمارہ ''خواتین دنیا'' نہایت اہم موضوعات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس میں 'خواتین کی تعلیمی پسماندگی' پر لکھا گیا مضمون قاری کی معلومات میں اضافہ کرتا ہے اس کے ساتھ 'زردوزی کی تاریخ' کے عنوان سے لکھا گیا مضمون نہایت اہم ہے جس کے ذریعے قاری کو حیدرآباد کی مسلم زردوزی کی کاریگر خواتین کی مالی ابتری کا اندازہ ہو جاتا ہے جو حیدرآباد کے نچلے علاقے میں رہائش پذیر ہیں۔ ان کا المیہ یہ ہے کہ انھیں کارخانوں کے مالکان اپنے کارخانوں میں ملازمت پر نہیں رکھتے بلکہ اپنے گھروں سے ہی کام کرتی ہیں۔ یہ خواتین سماجی و معاشی خود اختیاری حاصل کرنے کی سعی مسلسل میں کوشاں ہیں۔ افسانہ 'آئینہ' آج کے ماڈرن اور بے حس سماج کا المیہ پیش کرتا ہے۔ تحسین کاظمی کی غزلیں بھی دل کو چھو جاتی ہیں۔

میں اس رسالہ کی کامیابی کے لیے تمام اراکین کو مبارک باد پیش کرتی ہوں جن کی محنت اور کاوشوں نے اس رسالے کی ہر دلعزیزی میں اضافہ کیا ہے اور جو اس کی ترتیب و تدوین میں نہایت گراں قدر کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں۔ یہ انھیں حضرات کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ رسالہ دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔

ڈاکٹر رئیسہ پروین، ستیہ وتی کالج، اشوک وہار، دہلی

□□□

ڈاکٹر ریشما تبسم کو ''اہم خاتون ایوارڈ'' اور ''بہار کی خاتون آہن ایوارڈ'' سے نوازا گیا

گزشتہ 7 مارچ 2021 کو ادارہ ''جہان من'' کی جانب سے بین الاقوامی پرعزم اور متاثر کن خواتین کی ایک کانفرنس کا انعقاد زوم پلیٹ

فارم پر آن لائن کیا گیا جہاں مختلف شعبہ ہائے حیات میں نمایاں کارکردگی انجام دینے والی خواتین کو اعزازات سے نوازا گیا۔ اسی ضمن میں ڈاکٹر ریشما تبسم (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ تعلیم، ایل این متھلا یونیورسٹی، دربھنگہ) کو ''اہم خاتون ایوارڈ'' دیا گیا۔ اس کے دوسرے دن یعنی 8 مارچ کو بین الاقوامی یوم خواتین کے موقع پر ڈی پی آئی ایم دربھنگہ میں منعقدہ ایک تقریب میں انھیں 'بہار کی خاتون آہن ایوارڈ' سے نوازا گیا۔ واضح ہو کہ محترمہ تعلیم و تدریس کے علاوہ صحافت سے بھی وابستہ ہیں اور 'سریجن سمواد' نامی ایک کثیر لسانی تحقیقی ششماہی جریدہ کی مجلس ادارت کی رکن بھی ہیں۔ اس کے علاوہ 'Cervellopages' نامی بین الاقوامی کثیر پہلوی پیئر ریویوڈ/ ریفریڈ جرنل کی کارسپانڈنگ ایڈیٹر (اکاڈمکس) بھی ہیں۔ اب تک متعدد قومی و بین الاقوامی سمینار، کانفرنس اور مذاکروں میں شرکت کر چکی ہیں نیز قومی اور بین الاقوامی تحقیقی جریدوں میں ان کے آٹھ مقالے شائع ہو چکے ہیں۔

(فضا امام (دربھنگہ)، 10 مارچ 2021، روزنامہ تاثیر، پٹنہ)

دیوبند یونانی کالج کے طلبہ گولڈ میڈل سے سرفراز

دیوبند، 9 مارچ (رضوان سلمانی) دیوبند یونانی میڈیکل کالج اینڈ ریسرچ سینٹر دیوبند کے لیے یہ فخر کا مقام ہے کہ آج چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ کے ایک اعزازی پروگرام میں دیوبند یونانی میڈیکل کالج

کے طلبہ کو الگ الگ شعبہ میں اپنی پی جی ڈگری مکمل کرنے اور یونیورسٹی کو ٹاپ کرنے پر ریاست اتر پردیش کی گورنر آنندی بین پٹیل کے ذریعہ گولڈ میڈل دے کر اعزاز سے نوازا گیا۔ کالج کے ڈاکٹر نوشاد عالم کو ایم ڈی، فیزیولوجی شعبہ میں ڈاکٹر ریاض الدین کو ایم ایس جراحت اور ڈاکٹر ارمیلہ

کو ایم ایس گیانی میں یونیورسٹی ٹاپ کرنے پر گولڈ میڈل سے نوازا گیا۔ کالج کے طلبہ کو یہ اعزاز ملنے پر کالج کے منیجر پرنسپل اور اسٹاف کی طرف سے مبارکباد پیش کی گئی۔ کالج کے طلبہ کی اس کامیابی پر کالج کے منیجر ڈاکٹر قمر الزماں، ایڈمنسٹریٹر ڈاکٹر صبیحہ جمال نے میڈل حاصل کرنے والے طلبہ کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے کالج کے لیے فخر کا مقام ہے کہ انھوں نے یونیورسٹی ٹاپ کر کے کالج کا نام روشن کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ دوسرے طلبہ کو بھی اسی طرح محنت کر کے آگے بڑھنا چاہیے۔ ڈاکٹر قمر الزماں قریشی نے بچوں کی اس کامیابی پر انھیں مبارکباد پیش کی اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ طالب علم کی کامیابی ہی اساتذہ اور ادارے کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ انھوں نے تمام طلبہ و طالبات سے اپیل کی کہ وہ تعلیم کے حصول اور بہتر نتائج کی دوڑ میں ایک دوسرے پر سبقت لیں۔ اس موقع پر کالج کے پرنسپل ڈاکٹر اسلم اور پروفیسر ڈاکٹر افضال احمد نے طلبہ کی اس شاندار کامیابی پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یونیورسٹی میں ممتاز مقام حاصل کرنا کسی بھی طالب علم اور اس کے ادارہ کے لیے بڑے اعزاز کا مقام ہے، انھوں نے کہا کہ یقینی طور پر اس میں طلبہ، اساتذہ اور ادارہ کی محنت شامل ہیں، اس قسم کی شاندار کامیابی سے طلبہ کے ساتھ ساتھ اساتذہ کے حوصلے بھی بلند ہوتے ہیں اور انھیں نئی توانائی ملتی ہے۔ انھوں نے ممتاز مقام حاصل کر کے گورنر کے ہاتھوں اعزاز پانے والے تین طلبا کو مبارکباد پیش کی اور انھیں روشن مستقبل کی دعائیں دیتے ہوئے دیگر طلبہ کو اس سے سبق لینے اور آئندہ امتحانات میں مزید بہتر کارکردگی پیش کرنے کے لیے محنت کرنے پر زور دیا۔ علاوہ ازیں، ڈاکٹر طاہر حسن، ڈاکٹر ہلال حمید، ڈاکٹر ناصر، ڈاکٹر فراز رضوی، ڈاکٹر عبداللہ، ڈاکٹر محمد علی، ڈاکٹر کاشف ناز اور دیگر اسٹاف نے اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے گولڈ میڈل حاصل کرنے والے طلبہ کو مبارکباد پیش کی۔

(ہندوستان اردو ٹائمز، 10 مارچ، 2021)

خواتین کی طاقت کو مضبوط اور خود کفیل بنایا جائے

ہندوستانی ثقافت میں خواتین کی طاقت کو مختلف شکلوں میں خصوصی مقام دیا گیا ہے۔ حکومت ہند اور اتر پردیش سرکار کی جانب سے خواتین کی طاقت کو مستحکم کرنے کے مقصد سے مختلف اسکیموں اور پروگراموں کا اہتمام کیا جا رہا ہے تاکہ ہندوستانی ثقافت کے مطابق ملک کی خواتین کی طاقت کو مزید مضبوط اور خود انحصار بنایا جا سکے۔ ان خیالات کا اظہار ضلع کے انچارج نے ہندی بھون لوہیا نگر میں خواتین کے عالمی دن کے موقع پر منعقدہ پروگرام میں کیا۔ انھوں نے وہاں موجود تمام معززین اور عام لوگوں کو بیٹی اور بیٹے کے درمیان تمیز نہ کرنے اور بیٹیوں کو بااختیار بنانے پر حلف لیا۔ ڈسٹرکٹ آفیسر اجے شنکر پانڈے نے اس موقع پر کہا کہ خواتین کا عالمی دن ہندوستان میں خواتین کی طاقت کی اہمیت کی یاد دلاتا ہے۔ آج کا دن ہمیں اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ ہم نے گزشتہ سال میں خواتین کے احترام، ان کی عزت اور حفاظت کے حوالے سے کیے گئے کام کو یاد رکھنے کے لیے اور آئندہ ایک سال کے لیے منصوبہ بندی کرنے کے لیے قرارداد لے کر آج خواتین کی حفاظت، ان کے اعزاز اور خواتین کی طاقت کے لیے عزم کرنا چاہیے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ضلع میں آئندہ دنوں میں مختلف علاقوں میں خصوصی جہت حاصل کرنے والی خواتین کے لیے پروگرام منعقد کیے جائیں گے۔ چیف ڈیولپمنٹ آفیسر اسیمتا لال نے بتایا کہ مشن شکتی کے تحت ضلع میں خواتین کی طاقت، عزت اور خود انحصاری کے پروگرام چلائے جاتے ہیں۔

عالمی یوم خواتین کے موقع پر مختلف شعبوں میں عمدہ کام کرنے والی خواتین کو ضلع انچارج سریش کھنہ نے تعریفی اعزاز سے نوازا۔ اس کے علاوہ دیگر خواتین کو بھی نوازا گیا۔

(روزنامہ سہارا، 10 مارچ 2021)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

دستور ہند کا معمار ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 155

قیمت: 80 روپے

مقابلہ جاتی امتحانات کے لیے عام قانونی معلومات

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 375

قیمت: 180 روپے

رودر پریاگ کا آدم خور تیندوا

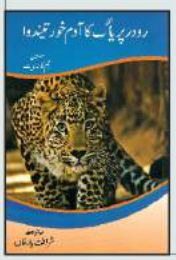

مصنف: جم کاربیٹ

مترجم: شرافت یار خاں

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 164، قیمت: 100 روپے

آؤ سائنسی خط پڑھیں!

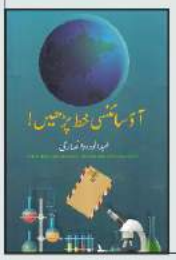

مصنف: عبدالودود انصاری

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 101

قیمت: 75 روپے

تاریخ و تہذیب و ثقافت

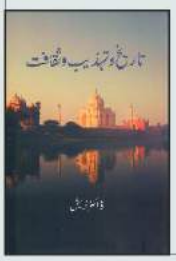

مصنف: ڈاکٹر نریش

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 210

قیمت: 120 روپے

اردو صحافت (آغاز سے 1857 تک کا ایک مختصر جائزہ)

مصنف: معصوم مرادآبادی

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 190

قیمت 110 روپے

اردو صحافت (1901 تا 1947 ایک مختصر جائزہ)

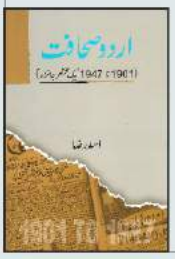

مصنف: اسد رضا

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 155

قیمت: 95 روپے

اردو صحافت (1948 تا 2000 ایک مختصر جائزہ)

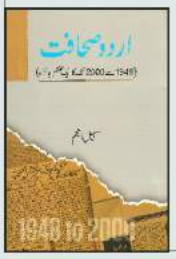

مصنف: سہیل انجم

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 116

قیمت: 80 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly April 2021, Vol. 5, Issue: 4
RNI. No. DELURD/2017/74026
ISSN 2581-4826
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

سوچ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش
اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025